The Memories of
My Melancholy Whores
(ناول)
اپنی سوگوار بیسواؤں کی یادیں
گابرئیل گارسیا مارکیز
ترجمہ: محمد عمر میمن
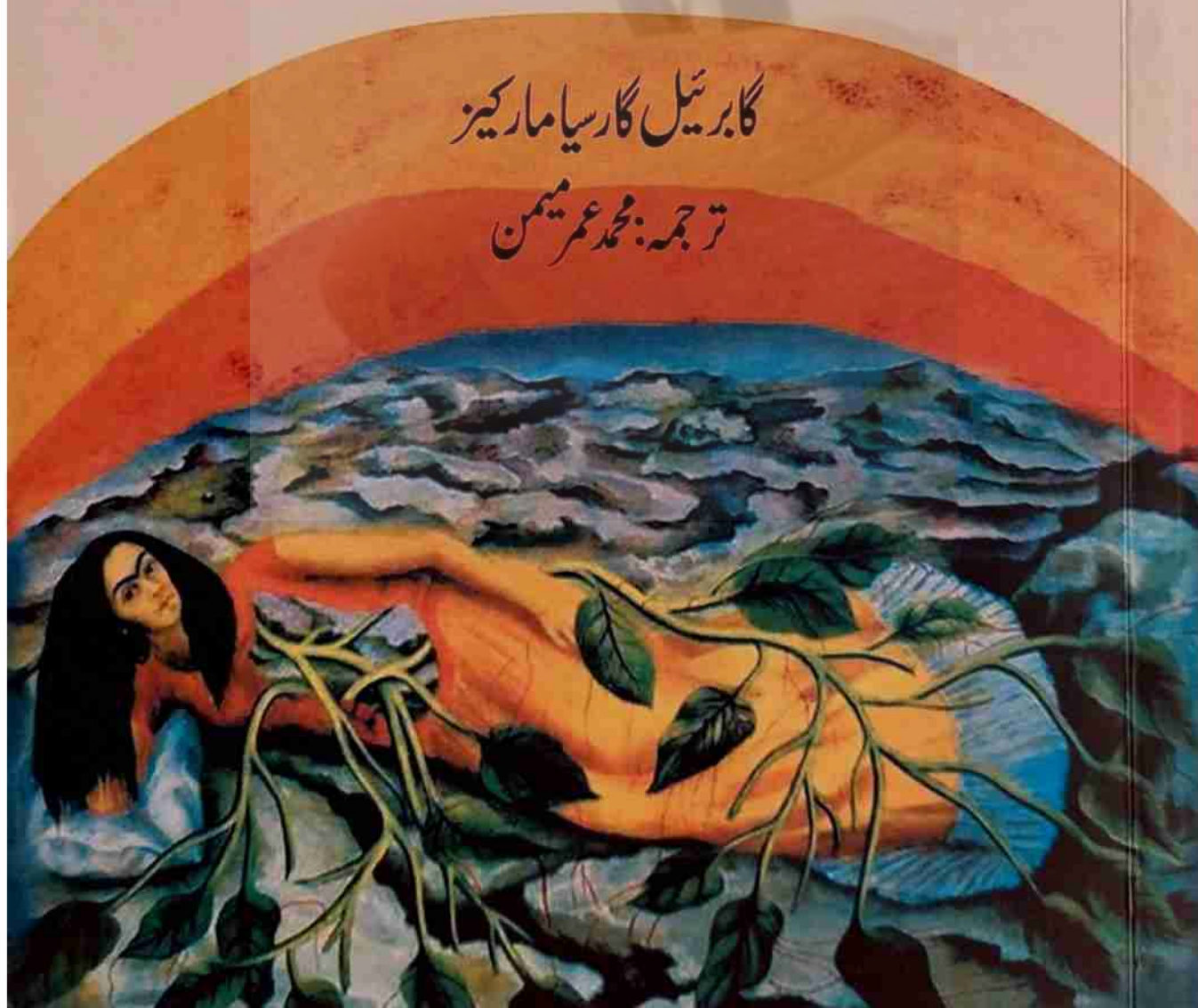
گابرئیل گارسیا مارکیز

اپنی سوگوار بیسواؤں کی یادیں

انگریزی سے ترجمہ

محمد عمر میمن

Apni sogwar beswaon ki yadain
Gabriel Garcia Marquez'
Memories of My Melancholy whores
Translated into Urdu
By: Muhammad Umar Memon

کمپوزنگ : احمد گرافکس، کراچی
طابع : طالب ایچ کھوکھر پرنٹرز، کراچی
قیمت : 250 روپے

بی۔ ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔
info@scheherzade.com

اسٹاکسٹ

CITY BOOK POINT
Naveed Square. Urdu Bazar, Karachi
Ph # 021-32762483
E-mail: citybookurdubazaar@gmail.com
City Book Point
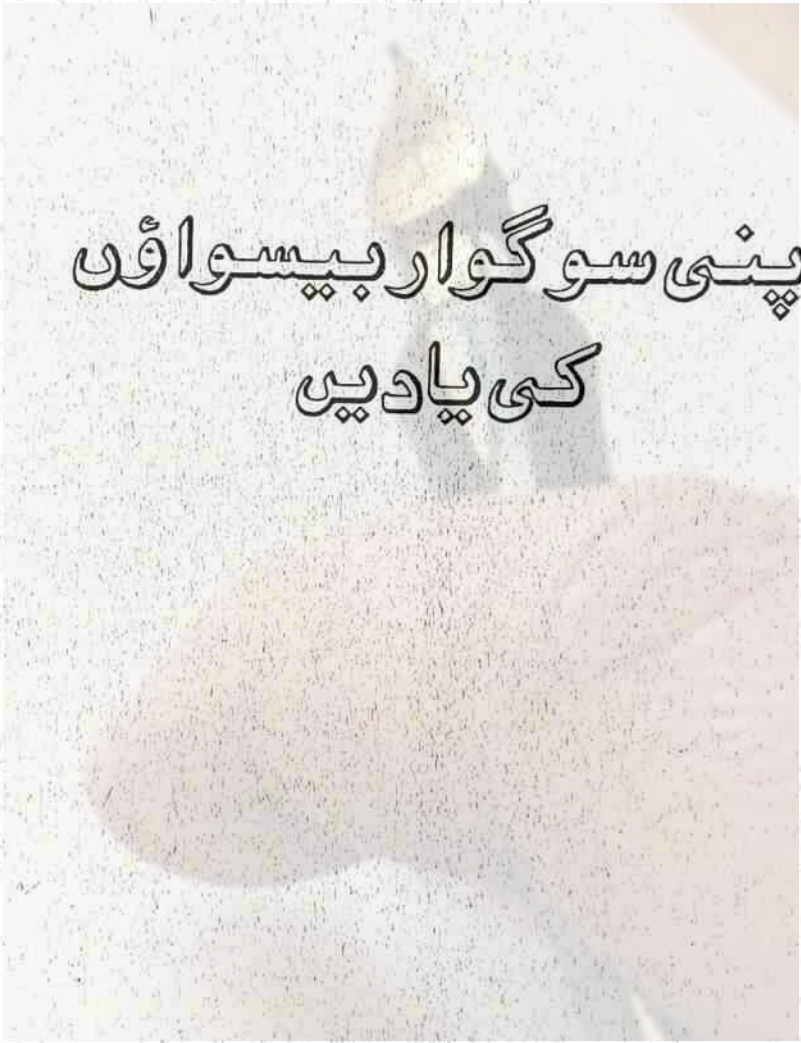
”اُس کو بدمزاقی کی کسی بھی حرکت
سے اجتناب کرنا ہوگا، مہمان سرا کی
خاتون نے کہن سالہ اِگچی کو خبردار
کیا۔ وہ محوِخواب لڑکی کے منہ میں اپنی
انگلی نہیں ڈالے گا، یا اسی قسم کی
کوئی اور حرکت۔“

—یَسُنَری کَوَبَتَا،
”محوِخواب حسیناؤں کی اقامت گاہ“

اپنی سوگوار بیسواؤں
کی یادیں
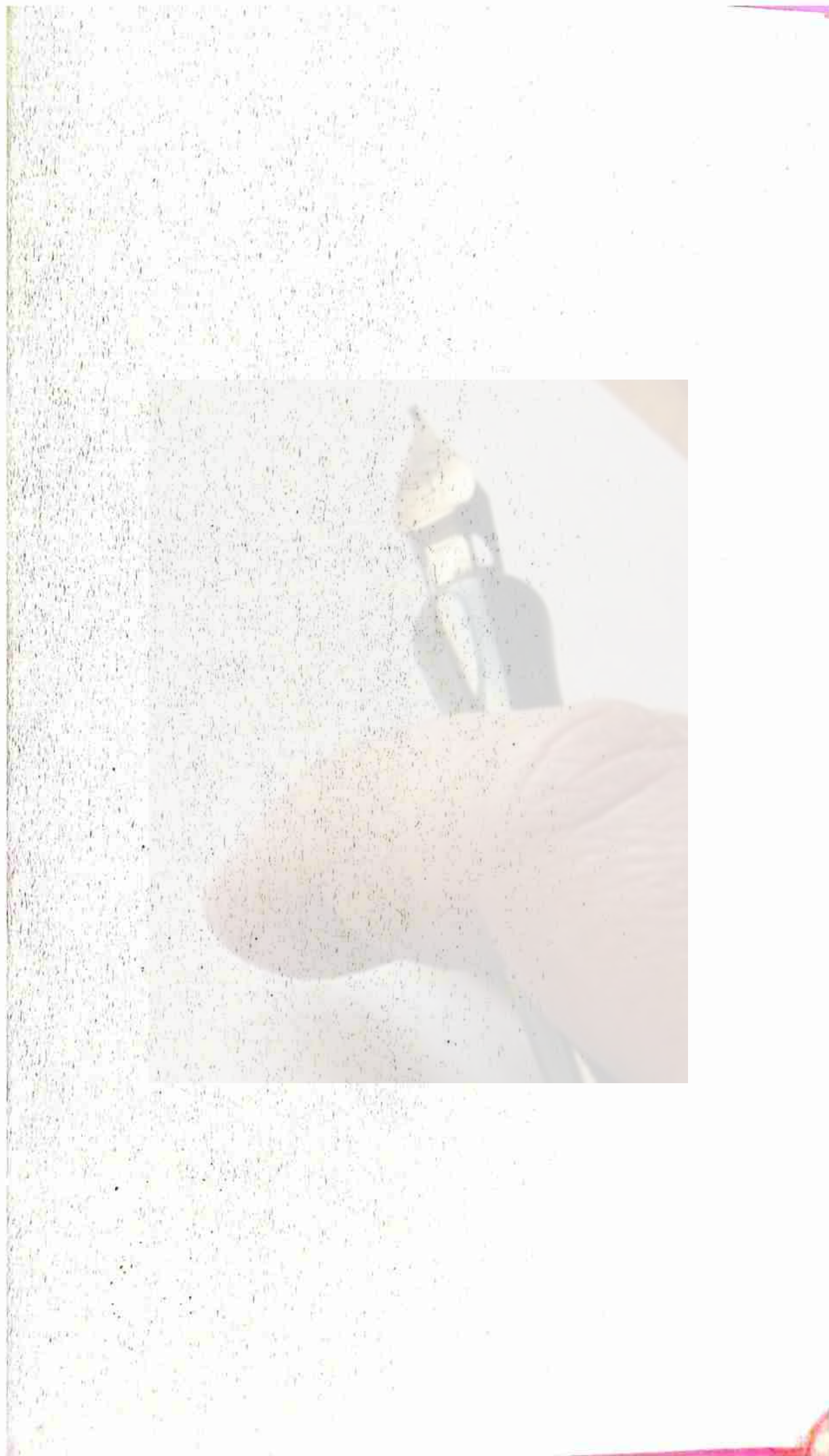
—۱—

جس سال میری عمر نوے سال کی ہوئی، میں نے خود کو کسی نوخیز باکرہ کے ساتھ رات بھر کی بے محابہ عیش کوشی کا تحفہ دینا چاہا۔ مجھے روسا گبرگس کا خیال آیا، جو ایک غیر قانونی چکلے کی مالکہ تھی اور جو کسی نئی لڑکی کے ہاتھ آتے ہی اپنے خاص گاہکوں کو مطلع کر دیتی تھی۔ میں کبھی اس، اور نہ ہی اُس کی بیشتر دوسری ہوسناک ترغیبات کے دام میں آیا، تاہم اُس نے میرے اصولوں کی پاکیزگی پر کبھی یقین نہیں کیا۔ پاک دامنی کا انحصار بھی وقت پر ہے، وہ ایک بداندیش مسکراہٹ کے ساتھ کہتی، تم دیکھو گے۔ وہ مجھ سے عمر میں تھوڑا سا کم تھی، اور اتنے سالوں سے مجھے اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی کہ ہوسکتا ہے مرکھپ گئی ہو۔ لیکن پہلی گھنٹی بجتے ہی میں ٹیلیفون پر اُس کی آواز صاف پہچان گیا، اور بغیر کوئی تمہید باندھے داغ دیا:

''آج ہی کے دن۔''

اس نے ایک سرد آہ بھری: میرے دل گرفتہ اسکالر، تم بیس سال تک غائب رہتے ہو اور لوٹنے پر مطالبہ کرتے ہو تو ناممکن کا، آہ۔ فوراً ہی اس کی پرانی مشاقی لوٹ آئی، اور اس نے کوئی نصف درجن لذیذ مال میرے انتخاب کے لیے پیش کیے، مگر بے ٹوک بات یہ ہے کہ وہ

سب کی سب استعمال شدہ تھیں۔ میں نے نا کردی، اس اصرار کے ساتھ کہ لڑکی کا باکرہ ہونا لازمی ہے اور اِسی شب مہیّا ہونا بھی۔ اس نے تشویش سے پوچھا: تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟ کچھ بھی نہیں، میں نے جواب دیا، اپنی روح کی گہرائیوں تک گھائل ہوکر، مجھے خوب معلوم ہے میں کیا کرسکتا ہوں اور کیا نہیں۔ غیر مت اُثر، وہ بولی ہوسکتا ہے کہ اسکالر سب کچھ جانتے ہوں، لیکن وہ ہر بات نہیں جانتے: دنیا میں تنہا جو کنیا راس (Virgos) بچ رہے ہیں وہ وہی ہیں جو تمھاری طرح اگست میں پیدا ہوے تھے۔ تم نے مجھے کچھ اور وقت کیوں نہیں دیا؟ آمد پہلے سے بتا کر نہیں آتی، میں نے کہا۔ کم از کم وہ انتظار تو کرسکتی ہے، وہ بولی، وہ جو کسی بھی مرد سے زیادہ باخبر تھی، اور اس نے بازار کی ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھوج لگانے کے لیے صرف دو دن کی مہلت مانگی۔ میں نے نہایت گمبھیرتا سے کہا کہ اس جیسے معاملے میں، میری عمر کو دیکھتے ہوے، ہر ساعت ایک سال کے برابر ہے۔ تو پھر یہ نہیں ہوسکتا، اس نے بغیر کسی شک وشبہے کے کہا، تاہم کیا فرق پڑتا ہے، یہ زیادہ مزے دار ثابت ہوگا، کیوں نہیں، میں تمھیں گھنٹے بھر میں فون کرتی ہوں۔

مجھے کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ لوگ کوسوں دور سے دیکھ سکتے ہیں کہ میں بدصورت ہوں، کم آمیز، اگلے وقتوں کا۔ لیکن اِن اوصاف سے تنفّر ہی کے باعث میں خود کو اِن کا اُلٹ ظاہر کرتا رہا ہوں، حتیٰ کہ آج کے دن تک، جب میں نے حتمی فیصلہ کرلیا ہے کہ خود اپنی مرضی سے بتاؤں جیسا کہ سچ مچ میں ہوں، کسی اور وجہ سے نہ سہی، محض اپنے ضمیر کو آسودہ کرنے کی خاطر ہی سہی۔ میں نے ابتدا روسا کبرکس کو اپنے غیر معمولی ٹیلیفونی پیغام سے کی ہے، کیونکہ، آج کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو، یہ ایک حیاتِ نو کا آغاز تھا، ایک ایسی عمر میں جب بیشتر فانی مرکھپ چکے ہوتے ہیں۔

میں ایک نوآبادیاتی طرز کے مکان میں رہتا ہوں، سن نکولاس پارک کے آفتابی رخ پر، جس میں مَیں نے اپنی زندگی کے سارے دن بغیر جورو یا ثروت گزارے ہیں، جہاں میرے والدین رہے اور مرے، اور جہاں میں نے تن تنہا مرنے کا فیصلہ کیا ہے، اُسی بستر پر جس میں

پیدا ہوا تھا اور ایک ایسے دن جو مجھے امید ہے کہ دور اور بے آزار ہوگا۔ یہ گھر میرے باپ نے انیسویں صدی کے اواخر میں ایک عوامی نیلام میں خریدا تھا، پہلی منزل آسائشی اشیا کی دکانوں کے واسطے اطالویوں کے ایک الحاق کو کرائے پر اٹھادی تھی، اور دوسری منزل اپنے واسطے مخصوص کرلی تھی، جہاں وہ ان اطالویوں کی ایک بیٹی کے ساتھ خوش و خرّم زندگی گزارنے والا تھا، فلورینہ دِدیوس کارگمنتوس، موتزارٹ کی ایک قابلِ ذکر ترجمان، ایک کثیر اللسان گیریبالڈین، اور حسین ترین اور فطری جوہر میں سب سے زیادہ مالا مال عورت جو کبھی شہر میں سکونت پذیر رہی ہو: میری ماں۔

گھر کشادہ اور روشن ہے، جس کے محراب گاڑھے آرائشی پلستر، اور فرش فلورنٹائن کاشی کاری کے ہیں، اور شیشے کے چار دروازے ہیں جو ایک لپٹواں بالکونی کی طرف لے جاتے ہیں جہاں میری ماں دوسری لڑکیوں کے ساتھ، جو اس کی عم زاد ہوتیں، مارچ کی راتوں میں عشقیہ آریے (arias) گانے کے واسطے آبیٹھتی۔ وہاں سے آپ سن نِکولاس پارک، گرجے، اور کرسٹوفر کولمبس کا مجسمہ دیکھ سکتے ہیں، اور ان سے پرے دریائی گودی کے مال گودام اور دریائے مگدَلینائے کبیر کے دہانے سے ساٹھ میل دور پر پھیلا ہوا کشادہ افق۔ گھر کا تنہا ناخوشگوار پہلو بس یہ ہے کہ سورج دن کے وقت مسلسل کھڑکیاں بدلتا رہتا ہے، اور اگر آپ آتش ناک نیم روشنی میں قیلولہ کرنے کی کوشش کریں تو ساری کھڑکیاں بند کرنی پڑتی ہیں۔ جب میں تن تنہا رہ گیا، بتّیس سال کی عمر میں، تو میں اُس کمرے میں اٹھ آیا جو میرے والدین کی خواب گاہ ہوا کرتا تھا، اس کمرے اور لائبریری کے درمیان ایک دروازہ لگوالیا، اور ہر اُس چیز کو نیلام کرنا شروع کردیا جس کی زندہ رہنے کے لیے مجھے ضرورت نہیں تھی، جس میں کتابوں اور خودکار پیانو (pianola) کے رولز کے علاوہ تقریباً ہر شے آگئی۔

میں چالیس سال تک "ایل دیاریو دِلپاس" کا کیبل ایڈیٹر رہا تھا، یعنی یہ کہ دنیا کی خبروں کو جنھیں ہم شورٹ ویوز یا مورس کوڈ میں فضائے بسیط سے گزرتے ہوئے پاتے مقامی نثر میں مرتّب اور مکمل کرنا۔ اِن دنوں اس مفقود پیشے سے ملنے والی پینشن پر میری گزراوقات مشکل

ہی سے ہوتی ہے، اور اس سے بھی کم گزارہ اُس پینشن سے جو مجھے ہسپانوی اور لاطینی قواعد پڑھانے کی ملتی ہے، اور اُس سنڈے کالم سے تو مجھے نہ ملنے کے برابر ملتا ہے جو گرمجوشی میں شمہ برابر کمی آئے بغیر میں پچھلی نصف صدی سے زائد عرصے سے مسلسل لکھتا رہا ہوں، اور موسیقی اور تھیئٹر کے ان پاروں سے تو کچھ بھی نہیں جو مجھ سے خاص رعایت برتنے کی خاطر ان موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں جب ممتاز فنکار شہر آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں نے لکھنے کے علاوہ کبھی کچھ اور نہیں کیا، لیکن ایک راوی کی استعداد اور جوہر میری قسمت میں نہیں آئے، ڈرامائی ساخت کے قوانین سے بالکل نابلد ہوں، اور اگر میں اس مہم پر چل پڑا ہوں تو یہ اس لیے کہ جو کچھ میں نے اپنی زندگی میں مطالعہ کیا ہے اُس کی ضوفشانی پر مجھے اعتماد ہے۔ سادی زبان میں، میں ایک سلسلے کی انتہا ہوں جسے نہ فضیلت اور نہ غیر معمولی ذکاوت کا حامل کہا جاسکتا ہے، جس کے پاس ان واقعات کے علاوہ جنھیں اپنی عظیم الشان محبت کے اس تذکرے میں صلاحیت بھر بیان کرنے کے لیے تیار ہوں، اپنے اخلاف کے واسطے چھوڑ جانے کے لیے کچھ بھی تو نہیں۔

اپنی نوی ویں سالگرہ کے دن مَیں، حسبِ معمول، فجر کے پانچ بجے بیدار ہوا۔ چوں کہ یہ جمعے کا دن تھا، میری واحد ذمے داری وہ کالم لکھنا تھی جو "ایل دیاریو دِ لپاس" میں اتوار کے اتوار میرے نام سے چھپتا تھا۔ علی الصباح میرے آثار ناخوش رہنے کے لیے نہایت اطمینان بخش تھے: صبحِ کاذب ہی سے میری ہڈیاں درد کر رہی تھیں، میری مقعد میں سوزش ہو رہی تھی، اور تین ماہ کی طویل یبوست کے بعد دہاڑتا بادل طوفان کی دھمکی دے رہا تھا۔ جب تک کافی تیار ہوتی میں نے غسل کر ڈالا، شہد کی مٹھاس والی ایک بڑی پیالی پی، کساوا بریڈ کے دو ٹکڑے کھائے، اور لِنن کا بالا پوش پہنا جو میں گھر میں استعمال کرتا ہوں۔

اس دن کے کالم کا موضوع، ظاہر ہے، میری نوّے ویں سالگرہ تھا۔ میں نے زندگی کے بارے میں کبھی اس طرح نہیں سوچا ہے کہ یہ کوئی چھت کی لیک ہے جو یہ بتاتی ہو کہ زندہ رہنے کے لیے اب آدمی کے پاس کتنی زندگی بچی ہے۔ اوائلِ جوانی میں، میں نے کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ جب موت کا وقت آتا ہے تو آدمی کے بالوں میں بسی جوئیں مارے ہیبت کے تکیے کی

طرف دوڑتی ہیں، اہلِ خانہ کو شرمسار کرنے کے لیے۔ یہ ایسی دل دوز تنبیہہ تھی کہ میں اسکول کے لیے اپنے بال منڈوانے کے لیے تیار ہوگیا، اور یہ جو دو چار ریشے باقی بچ رہے ہیں انھیں ہنوز ایسا صابن لگا کر دھوتا ہوں جو آپ کسی حشرے زدہ شکرگزار کتے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے، میں خود سے کہتا ہوں، کہ لڑکپن ہی سے میرا معاشرتی شائستگی کا احساس میرے احساسِ مرگ سے کہیں زیادہ پختہ رہا ہے۔

مہینوں سے میں پیش بینی کررہا تھا کہ میرا سالگرہی کالم گزرے سالوں کا عام شکوہ شکایت نہیں ہوگا، بلکہ بالکل اس کا اُلٹ: پیرانہ سالی کی حمد و ثنا۔ میں نے اس غور وخوض کے ساتھ ابتدا کی کہ مجھے کب بوڑھے ہونے کا احساس ہوا، اور مجھے یقین ہے کہ یہ احساس مجھے اُس دن سے کچھ دنوں پہلے ہی ہوا تھا۔ بیالیس سال کی عمر میں مَیں اپنی پیٹھ میں اٹھنے والے درد کے باعث جو دورانِ تنفّس تکلیف دے رہا تھا ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اُس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی: اس قسم کا درد تمھاری سی عمر میں بالکل قدرتی ہے، وہ بولا۔

''اس صورت میں،'' میں نے کہا، ''جو قدرتی نہیں ہے وہ میری عمر ہے۔''

ڈاکٹر میری طرف دیکھ کر تاسف سے مسکرایا۔ دیکھ رہا ہوں کہ فلسفی ہو، وہ بولا۔ اور یہ پہلی مرتبہ تھی کہ میں نے اپنی عمر کے بارے میں بڑھاپے کے طور پر سوچا، لیکن اس کو بھلا دینے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں ہر روز ہی کسی نہ کسی درد کی رفاقت میں چلنے کا عادی ہوگیا جو گزرتے ماہ و سال کے ساتھ اپنا مقام اور شکلیں بدلتا رہتا۔ کبھی تو یہ ایسے لگتا جیسے موت پنجے مار رہی ہو، اور اگلے دن غائب ہوجاتا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں نے سنا کہ بڑھاپے کی اوّلین علامت یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ جیسا لگے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے شبابِ جاوداں کی سزا دی گئی ہے، میں نے سوچا، کیونکہ میرا اپنی نیم رخ میرے باپ کے ٹھیٹ کریبیین خط و خال کے کبھی بھی مشابہ نہ ہوگا، اور نہ میری ماں کے شاہانہ رومی خط و خال کے۔ سچی بات یہ ہے کہ اوّلین تبدیلیاں اتنی آہستہ خرامی سے آتی ہیں کہ تقریباً بغیر نظر میں آئے ہی گزر جاتی ہیں، اور آپ خود کو ویسا ہی دیکھتے ہیں جیسا کہ ہمیشہ تھے، اندر سے، لیکن دوسرے لوگ

آپ کا مشاہدہ باہر سے کرتے ہیں۔

اپنی پانچویں دہائی میں جب میں نے اپنی یادداشت کو پہلی مرتبہ خطا ہوتے ہوئے پایا تو میں نے تصوّر کرنا شروع کر دیا کہ بڑھاپا کیسا ہوتا ہے۔ میں عینک کی تلاش میں پورا گھر اُتھل پُتھل کر کے رکھ دیتا تا آنکہ معلوم ہوتا کہ وہ تو میں نے پہنی ہوئی ہے، یا میں اسے پہنے پہنے ہی شاور میں چلا جاتا، یا میں اپنے فاصلے کے چشمے پر پڑھنے والا چشمہ چڑھا دیتا۔ ایک دن میں نے دو بار ناشتا کر ڈالا، کیونکہ پہلی بار کر کے بھول گیا تھا، اور میں اپنے دوستوں کی آنکھوں میں اس تشویش کو پہچاننے لگا جو انھیں مجھے وہی واقعہ دہراتے ہوئے پا کر ہوتی جو میں انھیں ہفتہ بھر پہلے سنا چکا ہوتا اور وہ مجھے اس سے متنبہ کرنے کا یارا نہ پاتے۔ اس وقت تک میں ان چہروں کی ایک فہرست مرتب کر چکا تھا جن سے مانوس تھا اور ایک دوسری فہرست ان ناموں کی جو ان میں سے ہر چہرے پر منطبق ہوتے تھے، لیکن سلام دعا کے وقت چہروں کو ناموں سے میل دینے میں ہمیشہ کامیابی نہیں ہوتی تھی۔

اپنی جنسی خواہش والی عمر نے مجھے کبھی فکر میں نہیں ڈالا کیونکہ میری جنسی طاقت کا دارومدار مجھ پر اتنا نہیں تھا جتنا عورتوں پر تھا، اور اگر انھیں خواہش ہو رہی ہو تو وہ خوب جانتی ہیں کہ کیسے اور کیوں کر۔ آج مجھے ان ہشتاد سالہ جوانوں پر ہنسی آتی ہے جو ڈاکٹر سے مشورہ لیتے پھرتے ہیں، اِن ناگہانی جھٹکوں سے متشوش ہو کر، یہ نہ جانتے ہوئے کہ نوّے سالوں کی لپیٹ میں یہ کہیں بدتر ہوتے ہیں لیکن اب اور اہمیت نہیں رکھتے: یہ جیے جانے کے خطرات ہیں۔ دوسری طرف، یہ زندگی کی فتحمندی ہے کہ بوڑھے لوگ غیر ضروری چیزوں کا حافظہ کھو دیتے ہیں، لیکن ان چیزوں کی یاد جو ہمارے لیے واقعی دلچسپی کی حامل ہوتی ہیں اکثر زائل نہیں ہوتی۔ سِسِرو نے بیک جنبشِ قلم یہ واضح کر دیا تھا: کوئی بڈّھا یہ نہیں بھولتا کہ اس نے خزانہ کہاں چھپا رکھا ہے۔

اِنھیں، اور ان جیسی دوسری سوچوں میں غلطاں میں نے کالم کا پہلا مسوّدہ مکمل کر لیا تھا کہ اگست کا سورج پارک میں بادام کے درختوں میں پھٹ پڑا، اور وہ رِور بوٹ جو ڈاک لاتی تھی،

جسے خشکی کے باعث پہلے ہی ایک ہفتہ تاخیر ہو چکی تھی، دہاڑتی ہوئی پورٹ کینال میں داخل ہوئی۔ میں نے سوچا: میری نوّے ویں سالگرہ آنے والی ہے۔ مجھے کبھی نہیں معلوم ہوگا، اور جاننے کا دعویٰ بھی نہیں کروں گا کہ کیوں، لیکن اُس تباہ کن برانگیختگی کے طلسماتی اثر سے مغلوب ہوکر میں نے روسا کبرکس کو فون کرنے کا فیصلہ کیا کہ وہ مجھے ایک رات عیش کوشی کے ساتھ اپنی سالگرہ منانے میں میری مدد کرے۔ میں نے سالوں اپنے جسم کے ساتھ الوہی شانتی میں گزارے تھے، اپنا وقت کلاسکس اور کنسرٹ کی موسیقی کے اپنے ذاتی پروگراموں کو بارِ دگر ڈھلمل یقینی سے مطالعہ کرنے کے لیے وقف کر دیا تھا، لیکن اُس دن میری خواہش کچھ اتنی منہ زور تھی کہ خدائی پیغام معلوم ہوتی تھی۔ فون کے بعد لکھتے رہنا ناممکن تھا۔ میں نے لائبریری کے ایک کونے میں جو صبح کے سورج کی کرنوں سے محفوظ رہتا تھا ہیمک (hammock) تان دیا اور اس میں جالیٹا، درحالے کہ میرا سینہ انتظار کی بے چینی سے بوجھل ہو رہا تھا۔

بچپن میں میری بڑی ناز برداریاں کی گئی تھیں، ایک ایسی ماں ملی تھی جو بڑے گنوں والی تھی اور جو پچاس سال کی عمر میں دِق سے مر گئی تھی، اور ایک ایسا ظاہر پرست باپ جو کبھی غلطی کا اعتراف نہ کرتا اور اپنے رنڈوے کے بستر میں ٹھیک ''معاہدۂ نیرلندیا'' پر دستخط والے دن فوت ہوا، جس نے ''ہزار دن کی جنگ'' اور گزشتہ صدی کی اَن گنت خانہ جنگیوں کا خاتمہ کیا۔ امن نے شہر کا حلیہ بدل کر رکھ دیا، کچھ اس طریقے پر کہ جس کی نہ پیش بینی کی جاسکتی تھی نہ خواہش۔ نشتر بے مہار عورتوں نے کالیہ اَنچہ کے کنارے کنارے واقع قدیم شراب خانوں کو ہیجان خیز حد تک مالا مال کر دیا، کالیہ اَنچہ جو بعد میں کامے لیون آبیلیو کے نام سے مشہور ہوا، اور اب پاسے یوکولون کہلاتا ہے، میری روح کے اس شہر میں جو اپنے باشندوں کے حسنِ اخلاق اور اپنی روشنی کی شفافی کے بدولت کیا مقامی کیا باہر سے آنے والے، سبھوں کو دل و جان سے بھاتا ہے۔

میں نے کبھی کسی ایسی عورت کے ساتھ ہم بستری نہیں کی ہے جس کے دام نہ چکائے ہوں، اور چند وہ جو کسبی نہیں تھیں، تو انھیں میں نے دلائل دے کر یا بالجبر پیسے لینے پر آمادہ کرلیا

چاہے بعد میں وہ انھیں کوڑے میں ہی کیوں نہ ڈال دیں۔ جب میں بیس سال کا تھا، میں نے ایک یادداشت رکھنی شروع کردی، جس میں نام، عمر، مقام کے علاوہ احوال اور جفتی کے طریقِ کار کا مختصر سا اندراج بھی ہوتا۔ پچاس سال کو پہنچنے تک میں پانچ سو چودہ عورتوں کے ساتھ کم از کم ایک بار صحبت کر چکا تھا۔ جب میرے جسم میں اتنی بہت ساری عورتوں سے متمتع ہونے کی تاب نہیں رہی اور میں ان کا کاغذ کا رہینِ منت ہوئے بغیر بھی حساب رکھ سکتا تھا تو میں نے یادداشت رکھنی چھوڑ دی۔ میری اپنی اخلاقیات تھی۔ میں نے کبھی عیش و طرب کی محفلوں (اور جیز) یا دن دہاڑے کی مڈبھیڑوں میں شرکت کی تھی نہ کبھی اپنے راز و نیاز میں دوسروں کو شریک کیا تھا یا اپنے جسم و روح کی مہمات کا ان کے سامنے تذکرہ، کیونکہ مجھے اپنی نوعمری سے ہی اس بات کا عرفان ہو چکا تھا کہ ان میں سے ہر ایک بات کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔

بس اگر کوئی غیر معمولی تعلّق تھا تو یہ وہ تھا جو میں نے سالہا سال تک وفاشعار دَمیانہ کے ساتھ قائم رکھا۔ وہ تقریباً جوان عورت تھی، کسی اِنڈین کی طرح، مضبوط، سیدھی سادی سی گنوار، کم گو اور اُجڈ، جو ننگے پاؤں چلتی کہ کہیں میرے لکھنے لکھانے کے عمل میں حرج نہ پڑ جائے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میں ہال وِے میں تنے ہیمک میں پڑا "لالوسانہ اندلوسا" (*La lozana andaluza*) (سرکش اندلسی دوشیزاہ) پڑھ رہا تھا، کہ معاً میری نظر لانڈری روم میں اس پر جا پڑی، اس حال میں کے وہ آگے کو جھکی ہوئی تھی اور اس قدر کوتاہ اسکرٹ پہنے ہوئی تھی کہ اس نے اُس کی رس بھری گولائیوں کو برہنہ کردیا تھا۔ شدید جنسی ہیجان سے مغلوب ہو کر میں نے اس کا اسکرٹ اوپر سرکا دیا، زیر جامہ گھٹنوں تک کھسکایا اور پیچھے ہی سے اس پر دھاوا بول دیا۔ اوہ، سنیور، وہ ایک سوگوار رنجیدگی کے ساتھ بولی، جس کا تعلّق دخول سے نہیں بلکہ خروج سے تھا۔ ایک شدید اہتزاز نے اس کے جسم کو ہلا کر رکھ دیا لیکن وہ اپنی جگہ پر مضبوطی سے جمی رہی۔ اسے شرمسار کرنے پر خود شرمسار ہو کر میں نے اُن دنوں مہنگی ترین عورت کو جو ادا کیا جاتا تھا اس کا دگنا اسے دینا چاہا، لیکن وہ ایک سینٹ بھی لینے پر آمادہ نہ ہوئی، اور نتیجے میں مجھے اس کی تنخواہ میں اضافہ کرنا پڑا، ماہ میں ایک سواری کے حساب سے، ہمیشہ اس وقت جب وہ لانڈری کرنے

میں مصروف ہوتی، اور ہمیشہ پیچھے کی طرف سے۔

ایک بار مجھے خیال آیا کہ پلنگ کے زائیدہ یہ ماجرے میری گمراہ زندگی کی آزاریوں کے بیانیے کے لیے ایک عمدہ بنیاد کا کام دے سکتے ہیں، اور غیب سے عنوان بھی مجھ پر اُتر آیا، ''اپنی سوگوار بیسواؤں کی یادیں۔'' دوسری طرف میری عوامی زندگی خشک سی تھی: ماں باپ دونوں مر چکے تھے، مستقبل سے تہی ایک مردِ مجرّد، ایک واجبی سا صحافی جو شاعری کے مقابلے میں چار بار فائنلیسٹ رہ چکا تھا، کارتاخینہ دِ اِندیاس کا خوے گوس فلورالیس، اور اپنی مثالی بدصورتی کے باعث خاکہ اڑانے والوں کا مرغوب۔ مختصر یہ کہ ایک ناکارہ زندگی جس کی بسم اللہ ہی برے طور پر ہو رہی تھی، ٹھیک اُس دوپہر جب میری ماں مجھ نو سالہ کا ہاتھ پکڑے پکڑے یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا ''ایل دیاریو دِلَپاس'' میری وہ روداد شائع کرے گا جو میں نے اپنی ہسپانوی اور فصاحت و بلاغت کی کلاس کے واسطے اسکول کی زندگی کی بابت رقم کی تھی۔ وہ مدیر کے حوصلہ انگیز نوٹ کے ساتھ اتوار کو شائع ہوگئی۔ سالوں بعد، جب مجھ پر کھلا کہ ماں نے اِس اور اِس کے بعد آنے والی سات رودادوں کو پیسے دے کر چھپوایا تھا، تو اس پر پشیمان ہونے کا وقت نکل چکا تھا، کیونکہ میرا ہفتہ وار کالم خود اپنے پروں پر پرواز کر رہا تھا اور میں ایک با صلاحیت مدیر اور ساتھ ہی ساتھ موسیقی کا نقاد بن چکا تھا۔

بَچیراتو کا ڈپلوما اعزاز کے ساتھ حاصل کرنے کے بعد میں نے بیک وقت تین مختلف پبلک سیکینڈری اسکولوں میں ہسپانوی اور لاطینی کی کلاسیں پڑھانے کی ابتدا کی۔ میں گھٹیا درجے کا استاد تھا، نہ مشق و مزاولت سے آشنا، نہ مدرسی کے پیشے کے لیے موزوں، اور ان بیچارے بچوں کے حق میں ذرا سے رحم سے بھی تہی جو اسکول کو اپنے ماں باپ کے ظلم سے بچنے کا آسان ترین طریقہ سمجھتے تھے۔ میں ان کے لیے صرف اتنا ہی کر سکتا تھا کہ انھیں اپنے چوبی فُٹے کی دہشت کا تابع رکھوں تاکہ وہ اپنے ساتھ کم از کم میری پسندیدہ نظم لے جائیں: اوفابیو، او غم، یہ جو تم اب دیکھتے ہو، خرابے، افسردہ پہاڑیاں، کبھی مشہور خوش آئند اتالیکہ تھے۔ پیرِ فرتوت ہونے کے بعد ہی کہیں جا کر مجھے اس ناگوار لقب کا علم ہوا جس سے

طلبہ مجھے پیٹھ پیچھے پکارتے تھے: پروفیسر افسردہ پہاڑی۔

زندگی نے بس مجھے اتنا ہی دیا تھا، اور اس سے زیادہ کے حصول کے لیے میں نے کبھی کوئی جدوجہد نہیں کی۔ میں کلاسوں کے درمیان تن تنہا لنچ کھاتا، اور شام کے چھ بجے فلکی خلا سے موصول ہونے والے سگنلوں کی تلاش میں اخبار کے ادارتی دفاتر جاتا۔ گیارہ بجے، جب اخبار کا ایڈیشن لپٹ چکا ہوتا، میری اصلی زندگی شروع ہوتی۔ ہفتے میں دو تین بار میں قحبہ خانوں کے علاقے، باڑیو چینو، میں رات بسر کرتا، اور ایسی بھانت بھانت کی ندیموں کی صحبت میں کہ دو بار مجھے سال کا بہترین گاہک ہونے کا اعزاز ملا۔ قریب کے گفے روما میں رات کا کھانا کھانے کے بعد میں اٹکل پچّو کسی چکلے کا انتخاب کرتا اور عقبی دروازے سے اندر سرک جاتا۔ یہ میں اس لے کرتا کہ اس میں مجھے تفریح کا احساس ہوتا، لیکن انتہائے کار یہ میرے کام کا جزو بن گیا، سیاسی گرو گھنٹالوں کی لاپروا گفتگو کا شکر جو اپنی رات بھر کی محبوباؤں کو ریاستی راز بتادیتے، اس سے بے خبر کہ گتّے کی دیواروں کی اوٹ سے یہ عوامی کانوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ بیشک اسی ذریعے سے مجھے یہ علم بھی ہوا کہ وہ میرے ناصبور تجرّد کو شبانہ اغلام بازی پر محمول کرتے تھے جس کی تسکین کالیہ دیل کِری مین پر پھرنے والے یتیم لونڈوں سے ہوتی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں یہ بھول بھال گیا، دیگر ٹھوس وجوہ کے علاوہ اس باعث بھی کہ وہاں میں نے اپنے بارے میں مثبت باتیں ہوتی ہوئی بھی سنیں، جنھیں میں نے ان کی صحیح قدرو قیمت کے بنا پر پسند کیا۔

میرے کبھی ایسے دوست نہیں رہے تھے جن سے قربت اور بے تکلفی ہو، اور وہ معدودِ چند جن سے قربت پیدا ہوئی وہ نیویارک میں ہیں۔ جس سے میرا مطلب ہے کہ مر مرا گئے ہیں، کیونکہ میرا خیال میں یہی وہ جگہ ہے جہاں معتوب ارواح جاتی ہیں تاکہ اپنی حیاتِ گزشتہ کی صداقت کو جھیلنے سے باز رہیں۔ اپنی سبک دوشی کے بعد سے میرے پاس کام وام بہت کم ہے الّا یہ کہ جمعے کی دوپہر اپنی نگارشات اخبار کے دفتر لے جاؤں یا بعض فرائض سے عہدہ برا ہوں جو ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں: بے لیاس آرتس میں ہونے والے کنسرٹس، سینٹرو آرتیستِکو

میں ہونے والی مصوّری کی نمائشیں، جن کا میں اساسی رکن ہوں، عوامی اصلاح کی سوسائٹی میں کبھی کبھار کوئی بلدیاتی کانفرنس، یا تے یاترو اَپولو میں فابِرگاس کی پیشکش جیسی اہم تقریب۔ نوجوانی میں مَیں کھلی فضا کے فلمی تھیٹر جایا کرتا تھا، جہاں ہم چاند گہن سے یا بھٹکی ہوئی بارش کے باعث ڈبل نمونیے کے واقعے سے متحیّر رہ جاتے۔ لیکن فلموں سے زیادہ مجھے ان ننھّی منّی دخترانِ شب سے دلچسپی تھی جو محض ایک ٹکٹ کی قیمت پر آپ کے ساتھ ہم بستری کے لیے تیار ہوجاتیں، یا مفت ہی، یا مستقبل میں ادائیگی پر۔ فلمیں میری پسندیدہ صنف نہیں۔ شیرلی ٹیمپل کی سوقیانہ پرستش نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔

تیس سال کی عمر سے پہلے میری ساری سیاحت وہ چار سفر تھے جو میں نے کارتاخینہ دِ اِندیاس میں خوے گوس فلورالیس کے لیے کیے، اور ایک بری رات جو میں نے ایک موٹر لانچ میں گزاری جب سکرامینتو مونتیل نے مجھے سانتا مارتا میں اپنے ایک قحبہ خانے کے افتتاح کی تقریب میں مدعو کیا تھا۔ رہی میری گھریلو زندگی، تو میں بہت زیادہ کھانے کا عادی نہیں اور مجھے بڑی آسانی سے خوش کیا جاسکتا ہے۔ جب دَمیانہ بوڑھی ہوگئی تو میرے لیے کھانا پکانا بند کردیا، ازآں بعد میرا باقاعدہ طعام اخبار کا دفتر بند ہونے کے بعد گفے روما میں آلو کا آملیٹ رہا ہے۔

چنانچہ، میری نوے ویں سالگرہ سے پچھلے دن میں نے روسا کَبرکَس کے جواب کے انتظار میں دوپہر کا کھانا نہیں کھایا نہ پڑھنے پڑھانا پر ارتکاز کرسکا۔ دو بجے کی تمازت میں جھینگر اپنی بھرپور قوت سے چرغ رہے تھے، اور کھلے دریچے کے باہر سورج کے سفر نے مجھے تین بار ہیمک کی جگہ تبدیل کرنے پر مجبور کردیا۔ مجھے ہمیشہ یہی لگتا کہ میری سالگرہ سال کے گرم ترین دنوں میں وارد ہوتی ہے، اور میں نے اس کو برداشت کرنا سیکھ لیا تھا، لیکن اُس دن میرے مزاج نے یہ مشکل کردیا۔ چار بجے میں نے اپنی روح کو یوحَن سباسچین باخ کے دَون پابلو کسالس کی فیصلہ کن پیشکس میں Six Suites for Unaccompanied Cello سے آسودہ کرنے کی کوشش۔ میں ساری موسیقی میں انھیں سب سے زیادہ درجۂ کمال کو پہنچا ہوا گردانتا ہوں، تاہم انھوں نے مجھے حسبِ معمول تسکین بہم پہنچانے کے بجاے میری حالت پہلے سے بھی زیادہ

گرادی۔ دوسرے سوئیٹ کے درمیان میری آنکھ لگ گئی، جو میرے خیال میں قدرے سست رو ہے، اور خواب کے عالم میں مَیں نے چیلو کی آہ و زاری کو اس بحری جہاز کے نالے سے خلط ملط کر دیا جو کوچ کر رہا ہو۔ ٹھیک اسی وقت ٹیلیفون نے مجھے جگا دیا، اور روسا کبرکس کی زنگ آلود آواز مجھے واپس اپنی دنیا میں لے آئی۔ تم کسی الو کی طرح خوش قسمت ہو، وہ بولی۔ میں نے تمھارے لیے ایک چُھٹیا ڈھونڈ نکالی ہے، جیسی تم چاہتے تھے اس سے بدرجہا بہتر، لیکن بس ایک خرابی ہے: انھیں دنوں چودہ سال کی ہوئی ہے۔ مجھے گو موت کے پوتڑے بدلنے میں تامل نہیں، میں نے مذاقاً کہا، اس کے مدعا سے نابلد۔ مجھے تمھاری فکر نہیں، وہ بولی، لیکن مجھے جیل میں تین سال سڑنے کا معاوضہ کون دے گا؟

ان کا معاوضہ کوئی بھی نہیں دے گا، اور وہ خود تو، ظاہر ہے، ہرگز نہیں۔ وہ اپنی دکان میں فروخت کرنے کے لیے کم سِنوں میں اپنا جال بچھاتی، لڑکیاں جنھیں وہ پیشے کی تربیت دیتی اور بالکل خشک نچوڑ ڈالتی، تا آنکہ وہ بلیک ایوفے مِیا کے تاریخی چکلے میں سند یافتہ طوائفوں کی کہیں زیادہ مکروہ زندگی گزارنے پہنچ جاتیں۔ اس نے کبھی جرمانہ نہیں ادا کیا تھا، کیونکہ اس کا صحن مقامی سرکاری اہل کاروں کی آماجگاہ تھا، گورنر سے لے کر میئر کے دفتر کے ادنیٰ ترین حاشیہ نشین تک، اور اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ مالکہ کو دل کھول کر قانون شکنی کی قدرت نہ ہوگی۔ جس کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ اس کے دمِ آخر کے تأملات کا مقصد محض اپنی عنایات سے کسبِ فائدہ تھا: وہ جتنی زیادہ قابلِ تعذیر ہوں گی، اسی تناسب سے مہنگی بھی۔ معاملہ اجرت میں دو پیسو کی فزونی پر طے ہوگیا، اور یہ طے پایا کہ میں اس کے مکان پر رات دس بجے پانچ پیسو نقد لیے پہنچ جاؤں گا جو پیشگی دینے ہوں گے۔ اس سے ایک لمحہ پہلے نہیں، کیونکہ لڑکی کو اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو کھانا کھلانا اور سلانا تھا اور اپنی ماں کی، جسے گٹھیا نے اپاہج کر دیا تھا، سونے کی تیاری میں مدد کرنی تھی۔

انتظار کے چار گھنٹے تھے۔ ان کے گزران کے ساتھ میرا قلب ایک تیزابی جھاگ سے بھر گیا جو سانس لینے میں مخل ہونے لگا۔ میں نے کپڑے تبدیل کرنے کی عملیات سے وقت

گزارنے کی ایک بے کارسی کوشش کی۔ اب اگر ڈمیانہ کہتی ہے کہ میں کسی بشپ کی رسمیات کے ساتھ کپڑے پہنتا ہوں تو، بیشک، اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ میں نے اپنے حجاموں والے الف سیدھے استرے سے ڈاڑھی بنائی اور شاور کے پانی کے ٹھنڈے ہوجانے کا انتظار کیا، کیونکہ سورج نے اسے نلکیوں میں کھولا دیا تھا، اور تولیے سے جسم خشک کرنے کی معمولی سی کوشش بھی مجھے دوبارہ پسینے میں تر بتر کردیتی۔ رات کی خوش بختی کی مطابقت سے میں نے لباس زیب تن کیا: سفید لِنن کا سوٹ، نیلے لہریوں کی قمیص جس کا کلف چڑھا کالر خوب اکڑا ہوا تھا، چینی ریشم کی ٹائی، بوٹ جنھیں سفید قلعی سے نئی زندگی بخشی گئی تھی، اعلیٰ سونے کی گھڑی، جس کی زنجیر میرے گریبان کے کاج سے اڑسی ہوئی تھی۔ پھر میں نے اپنی پتلون کے کف نیچے کی طرف گرا دیے تاکہ کسی کی توجہ اس طرف نہ جاسکے کہ میں انچوں سکڑ گیا ہوں۔

میرے بارے میں مشہور ہے کہ میں بخیل آدمی ہوں کیونکہ کوئی یہ گمان نہیں کرسکتا کہ جہاں میری رہائش ہے اگر وہاں نہ ہوتی تو میں اتنا مفلس بھی ہوسکتا تھا جتنا ہوں، لیکن سچ پوچھیں تو آج جیسی رات میری مالی استطاعت سے بہت دور کی بات تھی۔ اپنے پلنگ کے نیچے مخفی پیسوں کے ڈبے سے میں نے کمرے کا کرایہ ادا کرنے کے لیے دو پیسو، چار مالکہ کے لیے، تین لڑکی کے واسطے، اور پانچ اپنے رات کے کھانے اور دیگر چھوٹے موٹے اخراجات کے لیے محفوظے کے طور پر نکالے۔ بہ الفاظِ دیگر، وہ پورے کے پورے چودہ پیسو جو اخبار سے پورے ایک ماہ کی کالم نویسی کے ملتے تھے۔ یہ میں نے اپنی پیٹی کے ایک خفیہ خانے میں چھپائے، اور لینمان اینڈ کیمپ بارکلے اینڈ کمپنی کا فلوریڈا واٹر چھڑکا۔ دریں اثنا مجھے ہول کی کھرونچ محسوس ہوئی، اور آٹھ بجے کی پہلی ضرب پر میں ٹٹول ٹٹول کر زینے سے نیچے اترنے لگا، خوف سے پسینہ پسینہ، اور اپنی سالگرہ سے پہلے کی جگمگاتی رات میں باہر نکل گیا۔

گرمی میں کمی آچلی تھی۔ پاسے یوکولون پر خلق کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اپنی بھرپور آواز سے فٹ پاتھ کے بیچوں بیچ کھڑی ٹیکسیوں کے درمیان ساکر پر بحث رہے تھے۔ متارتَون کے شگفتہ پھولوں کے سایے میں ایک روش پر کوئی براس بینڈ ایک بے جان سا والز بجا رہا تھا۔ کالیہ دِلوس

نوتاریوس میں متین گاہکوں کی شکاری رنڈیوں میں کی ایک مختصر سی رنڈی نے مجھ سے حسبِ دستور سگریٹ مانگا، اور میں نے وہی جواب دے دیا جس کا عادی تھا: آج مجھے تمباکونوشی چھوڑے ہوئے تینتیس سال، دو ماہ، اور سترہ دن ہو گئے ہیں۔ ایل اُلمرے دِیورو سے گزرتے ہوئے میں نے منوّر کھڑکیوں میں اپنے اوپر نظر ڈالی، لیکن میں ویسا نہیں نظر آ رہا تھا جیسا محسوس کر رہا تھا بلکہ بہت عمر رسیدہ، پھٹی پرانی پوشاک میں ملبوس۔

دس سے ذرا پہلے میں ایک ٹیکسی میں داخل ہوا اور ڈرائیور سے سیمینتیر یو اونی ورسال لے جانے کے لیے کہا تاکہ اسے میری حقیقی منزل کا علم نہ ہو سکے۔ محظوظ ہو کر اس نے آئینے میں سے مجھے دیکھا اور بولا: یوں مجھے ڈرائیں نہیں، اسکالر صاحب، میری تمنّا ہے کہ خدا مجھے بھی اتنا ہی ہٹا کٹّا رکھے جتنے آپ ہیں۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ قبرستان کے سامنے اتر کر باہر آئے کیونکہ اس کے پاس ریزگاری نہیں تھی جو لَتمبا سے حاصل کرنی تھی، ایک نادار سا شراب خانہ جہاں قلّاش شرابی رات کے پچھلے پہر اپنے مرے ہوؤں پر آہ و زاری کرتے ہیں۔ جب کرایہ چک گیا تو ڈرائیور نے مجھ سے گمبھیر آواز میں کہا: محتاط رہیے گا جناب، روسا کبرکس کا گھر جیسے پہلے ہوا کرتا تھا اب اس کی پرچھائیں بھی نہیں رہا۔ میں اتنا ہی کر سکا کہ اس کا شکریہ ادا کر دوں، قائل، ہر کس و ناکس کی طرح، کہ پاسے یوکولون پر ڈرائیوروں سے دنیا کا کوئی راز مخفی نہیں۔

میں اس نادار علاقے میں داخل ہوا جو اس سے بالکل مختلف تھا جس سے میں اپنے زمانے میں واقف رہا تھا۔ اس کی گرم ریت کی سڑکیں، دروازہ کھلے گھر، کھردرے چوبی تختوں کی دیواریں، کڑوے پام کی چھتیں، اور بجری کے صحن اب بھی پہلے جیسے ہی تھے، تاہم اس کے مکینوں سے آسودگی اور اطمینان کا احساس رخصت ہو چکا تھا۔ زیادہ تر گھروں میں جمعے کی وحشیانہ پارٹیاں ہو رہی تھیں جن میں بجائے جانے والے ڈرم اور سنبال لگتا تھا ٹھیک جوفِ شکم میں گونج رہے ہوں۔ صرف پچاس سینتاووس کے عوض کوئی بھی اپنی پسندیدہ پارٹی میں شریک ہو سکتا تھا، لیکن وہ باہر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر بھی موسیقی کی سنگت پر رقص کر سکتا تھا۔ میں چلتا رہا، پریشان کہ کہیں زمین مجھے میری بانکے چھبیلے کی پوشاک سمیت نہ نگل جائے، لیکن ایک لاغر

مُلیٹو [کاکیشیا اور حبشی نسل کے والدین کی مخلوط اولاد] کے علاوہ جو ایک ٹینامینٹ ہاؤس کے قدمچے میں بیٹھا اونگھ رہا تھا، کسی بھی متنفّس نے میری طرف توجہ نہیں دی۔

''خدا کی امان میں جاؤ، ڈاکٹر،'' وہ اپنی پوری قوت سے چلایا،''اور، ہاں، جفتی مبارک! (ہیپی فکنگ!)''

میں اس کا شکریہ ادا کرنے کے علاوہ اور کیا کرسکتا تھا؟ آخری چڑھاؤ کے اوپر پہنچنے تک مجھے دم لینے کے لیے تین بار رکنا پڑا۔ وہاں سے مجھے تانبے کے رنگ کا ضخیم وجسیم سورج افق سے بلند ہوتا ہوا نظر آیا، اور شکم میں کسی غیر متوقع تقاضے نے مجھے نتیجے سے خوف زدہ کردیا، لیکن یہ کیفیت جلد ہی زائل ہوگئی۔ سڑک کے ختم پر، جہاں سے محلہ پھل دار درختوں کے جنگل میں بدل جاتا تھا، میں روسا گبرگس کی دکان میں داخل ہوا۔

وہ پہلے جیسی نہیں نظر آرہی تھی۔ وہ ایک غایت درجہ محتاط میڈم رہی تھی اور شاید اسی وجہ سے بے حد مشہور بھی، ایک بڑے ڈیل ڈول کی عورت جس کی ہم نے فایر ڈپارٹمنٹ کے سارجینٹ کی حیثیت سے تاج پوشی کرانا چاہا تھا، جتنا اس کی فربہی کے باعث اتنا ہی اپنے گاہکوں کے درمیان آگ بجھانے میں اپنی اہلیتِ کار کے باعث۔ لیکن تنہائی نے اس کے جسم کو سکڑا دیا تھا، اس کی جلد کی تازگی کو مرجھا دیا تھا، اور اس کی آواز کو مہارت سے اتنا تیز کردیا تھا کہ وہ اچھی خاصی عمر رسیدہ لونڈیا سے مشابہ نظر آتی تھی۔ گزرے وقتوں کے اثاثے میں سے اگر کچھ باقی بچ رہا تھا تو یہ اس کے بے عیب دانت تھے، بہ شمول اس دانت کے جس پر اس نے ادائیں دکھانے کی خاطر سونا منڈھوایا تھا۔ اپنے شوہر کی وفات کے سوگ میں جو پچاس سال تک زندگی میں اس کا شریک رہا تھا اس نے بڑی سخت گیری سے ماتمی لباس پہنا ہوا تھا، جس پر اپنے واحد بچّے کی موت کے ماتم میں، جو اس کی غیر قانونی سرگرمیوں میں اس کی مدد کرتا تھا، ایک طرح کے سیاہ بونیٹ کا اضافہ کرلیا تھا۔ صرف اس کی شفّاف، بے رحم آنکھیں ہنوز قوتِ حیات سے متحرک تھیں، اور اس کے باعث مجھے احساس ہوا کہ اس کے کردار میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔

دکان میں چھت سے ٹنگا ایک مدقوق سا بلب روشن تھا اور الماریوں کے تختوں پر فروختنی اشیا تقریباً ناپید تھیں۔ یہ دکان ایک ایسے بدنامِ زمانہ بیوپار کی پردہ پوشی کے کام بھی نہیں آتی تھی جس کے بارے میں سب کو علم تھا لیکن جس کا اقرار کوئی بھی نہیں کرتا تھا۔ جب میں پنجوں کے بَل اندر داخل ہوا تو اس وقت روسا کبرکس ایک گاہک کی دیکھ بھال میں مصروف تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ واقعی مجھے پہچان نہ سکی یا محض دکھاوے کے طور پر ایسا کررہی تھی۔ میں ایک بینچ پر اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ وہ اپنا کام نمٹا لے، اور اپنی یاد میں مَیں نے اسے اس کے پہلے کے روپ میں متشکل کرنے کی کوشش کی۔ متعدد بار، جب ہم دونوں ہی مضبوط اور صحت مند تھے، اس نے مجھے میری فریب خیالیوں سے بچایا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے میرے خیالات کا اندازہ کرلیا تھا کیونکہ وہ میری طرف مڑی اور میرا بڑے ہوش رُبا ارتکاز سے جائزہ لے ڈالا۔ وقت کا تم پر کچھ اثر نہیں ہوتا، اور اس نے ایک ماتمی آہ بھری۔ میں نے چرب زبانی سے کام لینا چاہا: اس کا تم پر اثر ہوتا ہے، لیکن یہ تمھیں بہتر بناتا ہے۔ میں بالکل سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں، وہ بولی، اس نے تو تمھارے مردہ گھوڑے جیسے چہرے کو بھی قدرے تازہ دم کردیا ہے۔ میں نے چھلکے جو بدل ڈالے تھے، ہو نہ ہو اس کی یہی وجہ رہی ہو، میں نے اسے ستانے کے لیے کہا۔ وہ کِھل اٹھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمھارے پاس تو کسی جفاکش غلام کا سا ہتھیار ہوا کرتا تھا، اس نے کہا۔ اب اس کی کارکردگی کا کیا حال ہے؟ میں جواب دینے سے کنی کاٹ گیا: جب ہم آخری بار ملے تھے اس وقت سے اب تک بس اتنا ہی فرق پڑا ہے کہ اب کبھی کبھار میری مقعد میں جلن سی ہوتی ہے۔ اس کی تشخیص فوری تھی: استعمال کی کمی۔ میں اسی مقصد کے لیے استعمال کرتا ہوں جو خدا نے مقرر کیا ہے، میں نے کہا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ کچھ وقت سے اس میں سوزش ہونے لگی تھی، ہمیشہ جب چاند پورا ہوتا۔ روسا نے اپنے سینے سلانے کی بُغچی میں کچھ ٹٹولا اور ہرے سے مرہم کی ایک ڈبیا کھولی جس سے گاوچشم کے مالشی تیل کی مہک آرہی تھی۔ لونڈیا سے کہنا کہ اپنی انگلی سے اس کی مالش کردے، اس طرح، اور اس نے اپنی شہادت کی انگلی کو بڑی بے حیا فصاحت و بلاغت سے حرکت دی۔ میں نے جواباً کہا کہ الحمد

للہ میں ہنوز ان دیہاتی مرہموں کے بغیر ہی کام چلانے کے قابل ہوں۔ اس نے میرا تمسخر کیا، یہ کہتے ہوئے: آہ، مائسترو، زندہ رہنے پر مجھ سے درگزر کریں۔ اور سودے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

لڑکی دس بجے ہی سے کمرے میں تھی، اس نے مجھے بتایا؛ وہ حسین تھی، صاف ستھری، اور شائستہ آداب، لیکن خوف سے جاں بلب کہ اس کی ایک ہم جولی جوگیرا کے ایک جہاز کے قلی کے ساتھ بھاگ گئی تھی دو گھنٹے کے اندر اندر خون بہہ جانے سے جاں بحق ہوگئی تھی۔ لیکن پھر، روسا نے اعترافاً کہا، یہ بالکل قابلِ فہم ہے کیونکہ گیئرا کے مرد مادہ ٹٹوؤں کو نغمہ سنج کرنے کے لیے مشہور ہیں۔ اور وہ اپنے موضوع کی طرف واپس آ گئی: بے چاری، اس پر مستزاد یہ کہ سارا دن فیکٹری میں بٹن ٹانکنے کا کام کرنا ہوتا ہے۔ یہ مجھے کوئی اتنا بھاری کام نظر نہیں آیا۔ مرد یہی سوچتے ہیں، اس نے جواب دیا، لیکن یہ پتھر توڑنے سے بدتر کام ہے۔ اس نے آگے یہ اعتراف بھی کیا کہ اس نے لڑکی کو برومائڈ اور بالچھڑ ملا کر پلا دیا ہے اور وہ اب پڑی سوتی ہے۔ مجھے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اس کا یہ ترحم معاوضہ بڑھوانے کی کہیں ایک اور چال نہ ہو، لیکن نہیں، اس نے کہا، میرا قول سونے کی طرح سچا ہے۔ قواعد طے شدہ تھے: ہر چیز کی قیمت فرداً فرداً ادا کرنی ہوگی، نقد اور پیشگی۔ بس اسی طرح تھا۔

میں اس کے پیچھے پیچھے صحن سے گزرا، اس کی شکن آلود جلد اور اس دقّت نے جو اسے اپنی متورم ٹانگوں کے باعث، جو بھاری سوتی جرابوں میں محبوس تھیں، چلنے میں محسوس ہو رہی تھی، میرے جذبات کو مت اُثر کیا۔ ماہِ تمام آسمان کے وسط میں چڑھ آیا تھا اور دنیا یوں لگتی تھی جیسے سبز پانی میں غرقاب ہوگئی ہو۔ دکان کے قریب عوامی منتظمین کی بے لگام رنگ رلیوں کے واسطے ایک پام کا بنا شامیانہ لگا تھا جس میں وافر مقدار میں چمڑے کے اسٹول، اور چوبی ستونوں کے درمیان جھولتے ہوئے ہیمک تھے۔ عقبی صحن میں، جہاں سے پھل دار درختوں کا جنگل شروع ہوتا تھا، ایک گیلیری میں پلستر سے آزاد ناپختہ اینٹوں سے بنے چھ کمرے تھے جن میں مچھروں کو باہر رکھنے کے لیے ٹاٹ کی کھڑکیاں تھیں۔ صرف ایک ہی کمرہ تصرّف میں تھا اور اس میں

ایک مدھم سی بتی جل رہی تھی اور ریڈیو پر تونیہ لَنیگرَہ ناکام محبت کا کوئی گانا گا رہی تھی۔ روسا کبرکس نے آہ بھری: بولیرو [ہسپانوی رقص یا سازینہ] ہی زندگی ہے۔ میں نے اتفاق کیا، لیکن آج کے دن تک میں نے ایک بھی بلیرو لکھنے کی ہمت نہیں کی۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا، لمحے بھر کے لیے اندر گئی، اور پھر باہر آ گئی۔ ابھی تک سو رہی ہے، اس نے بتایا۔ تمھیں چاہیے کہ اسے اس وقت تک آرام کرنے دو جتنے کی اس کے جسم کو ضرورت ہے، تمھاری رات اس کی رات سے زیادہ طویل ہے۔ میں ہکّا بکّا رہ گیا: تو تمھارا کیا خیال ہے کیا کروں؟ تمھیں خود پتا ہونا چاہیے، اس نے بے جواز طمانیت سے کہا، کوئی نہ کوئی وجہ تو ہے کہ تم اسکالر ہو۔ وہ مڑی اور مجھے میری دہشت کے ساتھ تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔

کوئی مفر نہ تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا، میرا دل الجھا ہوا تھا، اور دیکھا کہ لڑکی کرایے کے گرانڈیل پلنگ پر پڑی سو رہی ہے، اتنی ہی بے لباس اور مجبور جتنی اپنے پیدائش کے دن۔ وہ اپنے پہلو کے بَل لیٹی ہوئی تھی، دروازے کی جانب رخ کیے، جو چھت سے آنے والی تیز روشنی میں جس سے کوئی تفصیل بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی نہایا ہوا تھا۔ میں بیٹھ گیا تاکہ بستر کے سرے سے اس کا بنظرِ غائر مشاہدہ کر سکوں، میرے پانچوں حواس سحر زدہ۔ وہ گہرے سانولے رنگ کی اور قدرے گرم تھی۔ جمال آفرینی اور جسمانی صفائی کا انتظام اتنی سختی سے کیا گیا تھا کہ اس سے اس کے زیرِ ناف کا سبزۂ نورستہ بھی نظر انداز نہیں ہوا تھا۔ اس کے بالوں میں گھونگر ڈالے گئے تھے، اور اس کے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں پر قدرتی رنگ کی پالش چڑھی تھی، لیکن اس کی شِیرہ رنگ جلد ناہموار لگ رہی تھی اور بدسلوکی کی چغلی کھا رہی تھی۔ اس کے نومولود پستان ہنوز ایک لڑکے جیسے تھے، لیکن وہ کسی خفیہ توانائی سے جو پھٹ پڑنے کو تیار ہو چھلکنے کی حد تک لبریز نظر آ رہے تھے۔ اس کے جسم کا بہترین حصہ وہ بڑے، آہستہ خرام پیر تھے جن کی انگلیاں ہاتھوں کی انگلیوں ہی کی طرح لمبی اور حساس تھیں۔ پنکھے کے باوجود وہ تابناک پسینے میں نہائی ہوئی تھی، اور رات کے گزران کے ساتھ گرمی ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ بڑی بھدّی طور پر چپیڑے ہوئے آرائشی رنگ و روغن کی تہ کے نیچے اس کے چہرے کے صحیح خط و خال کا اندازہ

کرنا ناممکن تھا، چاول کے غازے کی موٹی سی پرت، رخساروں پر سرخی کے دو لیپ، نقلی پلکیں، بھویں اور پپوٹے کاجل سے دھواں دار، اور ہونٹ چاکلیٹی جلا سے چھپے ہوئے۔ لیکن آرائشیں اور سنگار کی اشیاء اس کے کردار کو نہیں چھپا سکی تھیں: مغرور ناک، بھاری بھویں، حساس ہونٹ۔ مجھے لگا: ایک نرم و نوخیز لڑاکو بیل۔

گیارہ بجے میں غسل خانے میں اپنے معمولات کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہوا، جہاں کرسی پر بے چاری لڑکی کی پوشاک کسی دولت مند لڑکی کے نفاست سے تہ کیے ہوئے لباس کی طرح رکھی ہوئی تھی: سوتی جالی دار، تتلیوں کے پرنٹ کا ڈریس، سستا زرد رنگ کا زیر جامہ، اور ریشوں کے سینڈل۔ کپڑوں کے اوپر ایک کم قیمت کڑا اور ایک نفیس زنجیر جس میں کنواری مریم کا میڈل لگا تھا دھرے تھے۔ سِنک کے کنارے ایک ہینڈ بیگ پڑا تھا جس میں لپسٹک، سرخی کی ڈبیا، ایک کنجی، اور کچھ ریزگاری تھی۔ ہر چیز اتنی ارزاں قیمت اور کثرتِ استعمال سے پامال کہ میں یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی اور اس سے زیادہ نادار ہو سکتا ہے۔

میں نے جسم سے کپڑے جدا کیے اور حتی المقدور انھیں ہینگر پر سلیقے سے جمانے کی کوشش کی تاکہ ریشمی قمیص اور استری کیے لِنن کی حالت ابتر نہ ہو جائے۔ زنجیر کے ذریعے فلش کیے جانے والے ٹائیلٹ میں پیشاب کیا، بالکل اُسی طرح بیٹھ کر جس طرح فلورینہ دِ دیوس نے بچپن میں مجھے سکھایا تھا تاکہ طشت کی گگر بھیگ نہ جائے، اور ہنوز، شرم و حیا برطرف، کسی اَن سَدھے بچھڑے کی بلا فصل، متواتر دھار کے ساتھ۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے سِنک کے اوپر جڑے آئینے میں جھانک کر دیکھا۔ دوسری طرف سے جس گھوڑے نے پلٹ کر مجھے دیکھا مردہ نہیں بلکہ ماتمی تھا، ایک پوپ کی سی غبغب، پھولے پھولے پپوٹے، اور چھدرے، لمبے بال جو کبھی میرے موسیقار کا ایال ہوا کرتے تھے۔

''جہنّم میں جاؤ،'' میں نے اُس سے کہا، ''اگر تمھیں مجھ سے محبت نہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں؟''

محتاط کہ کہیں لڑکی جاگ نہ پڑے، میں بستر پر بیٹھ گیا، ننگ دھڑنگ، میری آنکھیں سرخ

روشنی کی فریب کاریوں سے اس وقت تک مانوس ہو چکی تھیں، اور میں نے اس کا انچ انچ جائزہ لے ڈالا۔ میں نے اپنی شہادت کی انگلی کا سرا اس کی بھیگی ہوئی گدی پر پھرایا، اور اس نے اندر ہی اندر جھرجھری لی، اپنے جسم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک، ہارپ کے تار کی طرح، غراہٹ کے ساتھ کروٹ میری طرف کرلی، اور مجھے اپنی تیزابی تنفّس کی فضا میں لپیٹ لیا۔ میں نے اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے اس کی ناک کی چٹکی لی، اس نے اپنے بدن کو جھٹکا دیا، سر دور کر لیا، اور بیدار ہوئے بغیر میری طرف اپنی پیٹھ موڑ لی۔ ایک غیر متوقع ترغیب سے مغلوب ہو کر میں نے اپنے گھٹنے سے اس کی ٹانگوں کو جدا کرنے کی کوشش کی۔ پہلی ایک دو کوششوں کے درمیان اس نے رانیں اکڑا کر مزاحمت کی۔ میں اس کے کان میں گنگنایا: فرشتے دَیلگدینہ کے بستر کو گھیرے ہوے ہیں۔ وہ قدرے ڈھیلی پڑ گئی۔ ایک گرم سرسراہٹ میری رگوں میں دوڑ گئی، اور میرا سست، عزلت نشین وحشی اپنی طویل نیند سے بیدار ہو گیا۔

دَیلگد ینہ، میری جان، میں نے التجا کی، خواہش سے لبریز۔ دَیلگد ینہ۔ وہ افسردگی سے کراہی، میری رانوں سے پھسل کر نکل گئی، اپنی پیٹھ موڑ لی، اور یوں کنڈلی مار لی جیسے گھونگا اپنے خول میں۔ بالچھڑ کا عرق میرے لیے بھی اتنا ہی کارگر رہا ہوگا جتنا اس کے لیے، کیونکہ ہوا ہوایا کچھ نہیں، نہ اس کو، نہ کسی اور کو۔ لیکن مجھے اس کی پروا نہ تھی۔ میں نے اپنے سے پوچھا کہ جب خود میں اپنے کو اتنا سبک سر اور مغموم اور مُلیٹ مچھلی کی طرح سرد محسوس کر رہا تھا، تو اس کو نیند سے جگانے سے کیا حاصل ہوگا۔

تب نصف شب گزرنا کا گھنٹہ بجا، صریح اور ناگزیر، اور ۲۹ اگست کی صبح، سینٹ جان دی بپٹسٹ کی شہادت کا دن، شروع ہوئی۔ سڑک پر کسی کے اپنی پوری قوت سے رونے کی آواز آئی جس پر کسی نے توجہ نہ دی۔ میں نے اس کے لیے دعائے خیر مانگی، مبادا اسے اس کی حاجت ہو، اور اپنے لیے بھی، حاصل شدہ فوائد کے شکرانے کے طور پر: ایسا کر کہ کسی کو بھی یہ سوچ کر دھوکا نہ ہو، بالکل نہیں، کہ جس کا اسے انتظار ہے وہ اس کے مقابلے میں جو اس نے دیکھ لیا ہے زیادہ دیر تک قائم رہے گا۔ لڑکی نیند میں پھر کراہی اور

میں نے اس کے لیے بھی دعا کی: کیونکہ ہر شے اپنی باری آنے پر گزر جائے گی۔ اس کے بعد میں نے ریڈیو بند کر دیا، بتی بجھا دی، اور سو گیا۔

رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھل گئی، اس سے بے خبر کہ کہاں ہوں۔ لڑکی ہنوز یوں سمٹی سمٹائی پڑی سو رہی تھی جیسے جنین کوکھ میں، اس کی پشت میری طرف۔ مجھے مبہم سا احساس تھا جیسے میں نے اسے اندھیرے میں پلنگ سے اٹھتے ہوئے محسوس کیا ہو، اور غسل خانے میں پانی کے بہنے کی آواز سنی ہو، لیکن ہوسکتا ہے یہ خواب ہو۔ یہ انداز میرے لیے نیا تھا۔ میں ترغیب دلانے کی اداؤں سے نابلد تھا اور ہمیشہ اپنی رات بھر کی دلہنوں کا انتخاب بے سوچے سمجھے ہی کیا تھا، ان کی دل ربائیوں سے زیادہ ان کی اجرت کی بنیاد پر، اور ہم بغیر محبت کے کام کیلی کرتے، زیادہ تر نیم برہنہ اور ہمیشہ ہی تاریکی میں تاکہ اپنے کو جو تھے اس سے بہتر تصوّر کرسکیں۔ اس رات میں نے ایک محوِ خواب عورت کے جسم کا خواہش کے تقاضوں یا شرم و حیا کی رکاوٹوں کے بغیر عمیق مشاہدے کرنے کی بعید از امکان لذّت دریافت کی۔

پانچ بجے میں اٹھ گیا، مضطرب کہ میرے اتواری کالم کو دن کے بارہ بجے سے قبل ایڈیٹر کی میز پر ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اپنے وقت کے پابند معدے کو حرکت دی، ہنوز پورے چاند کی سوزش کے ساتھ، اور جب میں نے فلش کی زنجیر کھینچی تو محسوس ہوا کہ میری پرانی تلخیاں گند نکاسی کی بدرو میں چلی گئی ہیں۔ جب میں خواب گاہ میں واپس آیا، تازہ دم اور کپڑے پہنے، تو لڑکی صبح کی مصالحتی روشنی میں اپنی پشت کے بل سوئی ہوئی تھی، صلیب کی شکل میں بازو پھیلائے بستر پر آڑی پڑی تھی، اپنے بکر کی مطلق العنان مالکہ۔ اللہ سلامت رکھے، میں نے اس سے کہا۔ ساری رقم، اُس کی اور اپنی، میں نے تکیے پر رکھ دی، اور پیشانی پر بوسے کے ساتھ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہی۔ گھر، صبح دم سارے چکلوں کی طرح، بہشت سے قریب ترین شے تھا۔ میں باغ والے دروازے سے باہر نکلا تاکہ کسی سے مڈبھیڑ نہ ہو۔ سڑک پر جلتے سورج کے نیچے میں نے اپنے نوّے سالوں کا بوجھ محسوس کیا اور مرنے سے پہلے کی راتوں کی منٹوں کا منٹ منٹ شمار کرنے لگا۔

—۲—

میں ان یادوں کو اس بچی کھچی لائبریری میں رقم کررہا ہوں جو میرے والدین کی ملکیت تھی، اور جس کی شیلفز کرم ہائے کتابی کی مستقل مزاجی کے باعث بس کسی لمحہ گرنے والی ہیں۔ انتہائے کار، دنیا میں میرے کرنے کے لیے جو کچھ باقی رہ گیا ہے، اس کے لیے میری تشفی اپنی طرح طرح کی لغات سے ہوجائے گی، دون بینیتو پیرس گالدوس کی "ایپی سودیوس ناسیونالس" کی پہلی دو سیریز، اور "میجک ماؤنٹن"، جس نے مجھے اپنی ماں کے مزاج کی کیفیتوں کو سمجھنا سکھایا، جنھیں تپ دِق نے بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

بڑی میز جس پر لکھ رہا ہوں، بقیہ فرنیچر کے برخلاف، میرے برخلاف، وقت کے گزران کے ساتھ ساتھ زیادہ صحت مند ہوتی ہوئی لگتی ہے، کیونکہ میرے دادا، جہاز پر کام کرنے والا بڑھئی، نے اسے اعلیٰ درجے کی لکڑیوں سے بنایا تھا۔ اس وقت بھی جب مجھے لکھنا نہیں ہوتا، میں ہر صبح اسے اُس مہمل پابندی کے ساتھ آراستہ کرتا ہوں جس کی وجہ سے اتنی بہت سی معشوقائیں میرے ہاتھ سے جاتی رہی ہیں۔ وہ کتابیں جو میری شریکِ جرم ہیں میری دسترس میں ہیں: رائیل ایکیڈمی کی دو جلدی "پریمیر دِکسیوناریو ایلوسترادو"، جس پر ۱۹۰۳

کی تاریخ پڑی ہے؛ دون سباستیان دِکوواڑوویاس کی "تیسورو دِللنگوا کاستیلیانا او اِسپانیولا"؛ دون اَندرِس بیلیو کی گرامر، مجھے کوئی معنیاتی سوال درپیش ہوتو اس کے لیے از بس ضروری؛ دون خولیو کسارِس کی موجد "ڈکسیوناریو اِیدیولوخیکو" خاص طور پر متضاد اور مترادف الفاظ کی نسبت سے؛ نیکولا زنگاریلّی کی "وکابولاریو دیلا لنگوا اتالیانا" جس سے میں اپنی ماں کی زبان کی بابت مدد لیتا ہوں، جو میں نے پالنے میں سیکھی تھی؛ اور ایک لاطینی کی لغت: چونکہ یہ پچھلی دو کی ماں ہے، میں اسے اپنی مقامی زبان گردانتا ہوں۔

لکھنے کی میز کی بائیں طرف میں ہمیشہ دفتری سائز کے رَیگ پیپر کے پانچ ورق رکھتا ہوں جو میرے اتواری کالم لکھنے کے لیے ہوتے ہیں، اور روشنائی جذب کرنے کے لیے ایک ریت بھرا سینگ، جسے میں سیاہی چوس کاغذ پر ترجیح دیتا ہوں۔ دائیں طرف دوات اور ہلکے رنگ کی بالسا لکڑی کا قلمدان مع اپنے سنہری قلم کے ہوتا ہے، کیونکہ میں ابھی تک اسی رومانوی خط کا استعمال کرتا ہوں جس کی فلورینہ دِدیوس نے مشق کرائی تھی تا کہ میں اس کے شوہر کا عہدہ دارانہ اندازِ تحریر اختیار کرنے سے باز رہوں، جو تا دمِ حیات مصدق دستاویزات (نوٹیری پبلک) اور سرٹیفائڈ اکاؤنٹینٹ رہا تھا۔ کچھ وقت پہلے ٹائپ سیٹنگ میں زیادہ صحت اور متن کے حساب سے لائنو ٹائپ میں سیسے کے استعمال کا بہتر طور پر تخمینہ لگانے کے لیے اخبار نے یہ حکم جاری کیا کہ سب ٹائپ کریں، لیکن میں نے یہ بد عادت کبھی نہیں ڈالی۔ میں نے ہاتھ سے لکھنا اور پھر اسے ٹائپ رائٹر پر کسی مرغی کی سی محنت طلبی سے ٹھونگیں مار مار کر منتقل کرنا جاری رکھا، سب سے زیادہ عمر رسیدہ تنخواہ دار ہونے کی رعایت کا صد شکر۔ آج، سبک دوش لیکن شکست خوردہ نہیں، مجھے گھر بیٹھ کر لکھنے کا مقدس اعزاز حاصل ہے، فون آف دی ہُک تا کہ کوئی خلل انداز نہ ہو سکے، اور نہ کوئی محتسب (سینسر) جو میرے شانوں کے پیچھے سے جو لکھ رہا ہوں اس کی سن گن لے سکے۔

میں کتوں، چڑیوں یا ملازموں کے بغیر رہتا ہوں، سوائے وفادار دَمیانہ کے جس نے مجھے ایسی مشکلات سے نجات دلائی ہے جن کی بھول کر بھی توقع نہیں کی جا سکتی، اور جو اب بھی

ہفتے میں ایک بار جو کچھ کام ہوتا ہے اسے نمٹانے آ جاتی ہے، جس حالت میں ہے اس کے باوجود، جب اس کی بینائی اور مہارت جانے لگی ہے۔ بسترِ مرگ پر میری ماں نے کہا تھا کہ جوانی ہی میں کسی اجلے رنگ کی عورت سے شادی کروں اور کم سے کم تین بچّے پیدا کروں، جن میں سے ایک لڑکی ہو جس کا نام اس کے نام پر رکھوں، جو اس کا اور نانی دونوں کا تھا۔ میرا ارادہ اس کی خواہش کی تعمیل کا تھا، لیکن میرا جوانی کے بابت تصوّر اتنا لچک دار تھا کہ مجھے کبھی یہ خیال نہیں ہوا کہ وقت نکل چکا ہے۔ تا آنکہ ایک بے حد گرم دوپہر کو میں نے پرادومار میں پالومار دِکاسترو خاندان کے گھر میں ایک غلط دروازہ کھول دیا اور رَخمینہ اورتیس کو، جو بیٹیوں میں سب سے چھوٹی تھی، دیکھا کہ متصل خواب گاہ میں ننگی پڑی قیلولہ کر رہی ہے۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی، اور اس نے مڑ کر اپنے شانے کے اوپر سے اتنی تیزی سے دیکھا کہ مجھے فرار کی مہلت نہیں ملی۔ اوہ، معاف کرنا، میں بمشکل کہہ سکا، دل منھ میں اُبلا پڑ رہا تھا۔ وہ مسکرائی، کسی غزال کی دل آویزی کے ساتھ میری طرف کروٹ بدلی، اور مجھے اپنے پورے جسم کا دیدار کرا دیا۔ پورا کمرہ اس کی آنچ دیتی جنسی قربت سے بھرا بھرا محسوس ہونے لگا۔ اس کی عریانی مطلق نہ تھی، کیونکہ مانے کی "اولمپیا" کی طرح، اس کے کان کے پیچھے نارنگی پنکھڑیوں والا کوئی زہریلا پھول تھا، اور اس نے اپنی دائیں کلائی پر ایک سونے کی چوڑی بھی پہنی ہوئی تھی اور ننّھے منّے موتیوں کا ہار بھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس سے زیادہ جذبات کو برانگیختہ کرنے والی کوئی اور شے میں اپنے طولِ عمر کبھی نہیں دیکھوں گا، اور آج میں اس کی تصدیق کر سکتا ہوں کہ میں حرف بہ حرف صحیح تھا۔

میں نے پھٹ سے دروازے بند کر دیا، اپنے سہو پر نادم اور اسے بھول جانے کا پکّا ارادہ کیے ہوئے۔ لیکن رَخمینہ اورتیس نے یہ نہیں ہونے دیا۔ باہمی دوستوں کے ہاتھوں وہ مجھے پیغامات، اکسانے والے رقعے، بربریت سے پُر دھمکیاں بھیجتی، اور ساتھ ساتھ یہ افواہ بھی پھیلا دی کہ ہم ایک دوسرے کی محبت میں پاگل ہوئے جا رہے ہیں حالانکہ ایک دوسرے کے ساتھ کبھی ایک لفظ کا تبادلہ بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی کشش کا مقابلہ کرنا ناممکنات میں سے تھا۔ اس کی آنکھیں جنگلی بلّی جیسی تھیں، جسم کپڑوں کے اندر بھی اتنا ہی ترغیب دلانے والے جتنا کپڑوں

کے باہر، ہنگامہ خیز سنہری بال، اتنے شاداب اور گھنے کہ ان کی نسوانی مہک مجھے اپنے تکیے پر مارے طیش کے رلا رلا دیتی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ کبھی محبت میں نہیں بدلنے والا، لیکن وہ شیطانی کشش جو مجھے اس میں محسوس ہوتی اتنی آتشیں تھی کہ میں مڈبھیڑ ہونے والی ہر سبز چشم طوائف سے اپنے کو آسودہ کرنے کی کوشش کرتا۔ پرادومار میں اس کے بستر میں پسرے ہونے کی یاد کی آگ کو کبھی بجھا نہیں سکا، سو میں نے رسمی طور پر شادی، انگشتریوں کے تبادلے، اور یوم خمیس [Pentecost: ایسٹر کے بعد کا ساتواں اتوار] سے پہلے بڑی دھوم دھام کی شادی کے اعلان کی پیشکش کے ساتھ اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

اس خبر نے سوشل کلبز کے مقابلے میں بارّیو چینو میں زیادہ دھماکا پیدا کیا۔ پہلے پہل تو لوگوں نے اس کا تمسخر اڑایا، لیکن بعد میں یہ ان متجر خواتین میں جو شادی کو مقدس سے زیادہ مضحکہ خیز صورتِ حال گرادانتی ہیں باقاعدہ کلفت کا باعث بن گئی۔ میری منگنی کی رسم کے موقعے پر، جو میری منگیتر کے گھر کی ٹیرس پر، مع اس کے امیزونی باغات اور لٹکے سرخس، منائی گئی، عیسائی اخلاقیات کی جملہ رسوم کی پابندی کی گئی۔ میں سات بجے شام وارد ہوتا اوپر سے نیچے تک سفید لِنن میں ملبوس، دست کاری کے منکے یا سوئس چاکلیٹ کا تحفہ لیے، اور ہم دس بجے تک باتیں کرتے، نصف اشاروں میں، نصف سنجیدگی کے ساتھ، درایں اثنا چچی اَرخینیدہ نگراں رہتی، جو پلک جھپکنے میں اونگھ جاتی، حاضرہ ناولوں کی شیپرونس کی طرح۔

جوں جوں ہماری ایک دوسرے سے واقفیت بڑھی ،خمینہ اور زیادہ ندیدی ہوگئی، وہ جون کی بڑھتی ہوئی اُمس دار تپش میں اپنی انگیا اور پیٹی کوٹ ڈھیلے کر دیتی، اور اندھیرے میں اس کی غارت گری کا تصوّر بہ آسانی کیا جاسکتا تھا۔ منگنی کے دو ماہ کے اندر اندر بات کرنے کے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں رہ گیا تھا، اور کچھ کہے بغیر محض نومولودوں کے لیے اونی موزے کروشیا کرتے ہوے اس نے بچوں کا موضوع چھیڑ دیا۔ کسی راضی برضا منگیتر کی طرح میں بھی اس کے ساتھ کروشیے کا کام سیکھ گیا، اور اس طور پر ہم نے شادی سے پہلے کی بے کار ساعتیں گزاریں: میں لڑکوں کے لیے ننھی منی نیلی بوٹیز کروشیا کرتا، اور وہ لڑکیوں کے لیے گلابی، ہم

دیکھیں گے کہ کس کا اندازہ صحیح نکلتا ہے، تا آنکہ پچاس بالکوں سے زیادہ کے لیے بوٹیز تیار ہوگئیں۔ گھڑی کے دس بجانے سے قبل میں گھوڑا گاڑی میں جا بیٹھتا اور باڑیو چینو میں خدا کی امان میں اپنی رات گزارنے چلا جاتا۔

باڑیو چینو میں تجرّد کی جو طوفانی الوداعیں مجھ سے کہی گئیں وہ سوشل کلب کی اجیرن شاموں کا بالکل الٹ تھیں۔ یہ ایک ایسا تقابل تھا جس نے واقعی یہ جاننے میں میری مدد کی کہ ان دو دنیاؤں میں سے کون سی فی الحقیقت میری تھی، اور میری تمنا تھی کہ دونوں ہی میری ہوں گی، ہر ایک اپنے مناسب وقت پر، کیوں کہ ہر ایک سے میں دوسری کو اس طرح دور ہوتا ہوا دیکھتا جیسے سمندر میں دو جہاز ایک دردناک آہ بھرتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب سے گزر جاتے ہیں۔ شادی سے پچھلی رات ایل پودیر دِدیوس میں ہونے والے رقص میں ایک آخری رسم شامل تھی جو صرف ایک شہوت میں دھنسے گیلیشین کاہن (پریسٹ) ہی کی اختراع ہوسکتی تھی، جس نے سارے کے سارے نسوانی عملے کو نقابوں اور نارنجی پھولوں سے آراستہ کر دیا تھا تاکہ وہ سب کی سب مجھ سے ایک عالمگیر شعیرے میں بیاہ رچائیں۔ یہ بڑی بے حرمتیوں کی رات تھی جس میں بائیس عورتوں نے محبت اور اطاعت کا وعدہ کیا اور میں نے بدلے کے طور پر ہمارے تادمِ حیات وفاداری اور دستگیری کا۔

کسی لاعلاج چیز کے دھڑکے نے مجھے سونے نہ دیا۔ بیچ رات میں مَیں نے گرجے کے گھنٹہ گھر میں ساعتوں کے گزرنے کا شمار شروع کر دیا، تا آنکہ وہ خوفناک سات عدد گھنٹیاں بجیں جب مجھے گرجے میں ہونا چاہیے تھا۔ آٹھ بجے ٹیلیفون بجنا شروع ہوا، طویل، اٹل، متلون گھنٹیاں جو مسلسل ایک گھنٹے تک بجتی رہیں۔ نہ صرف یہ کہ میں نے جواب نہیں دیا: میں نے دَم نہیں مارا۔ دس سے ذرا پہلے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، پہلے مٹھیاں برسیں، پھر چیخنے چلانے کی وہ آوازیں آئیں جنھیں میں پہچانتا اور جن سے متنفر تھا۔ مجھے یہ خوف دامن گیر تھا کہ وہ کہیں دروازہ ہی نہ گرا ڈالیں جس کے نتیجے میں کوئی سنگین حادثہ ہوجائے، لیکن گیارہ کے قریب گھر ایسی رونگٹے کھڑی کر دینے والی خاموشی میں اتر گیا جو انقلاب انگیز حادثوں کے جلو میں آتی ہے۔

تب میں رو دیا، اُس کے لیے اور اپنے لیے، اور میں نے اپنے پورے دل سے یہ دعا مانگی کہ اب زندگی میں اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھوں گا۔ کسی سنت ولی نے شاید میری بات سن لی، گو آدھی ہی، کیونکہ ژمینہ اورتس اسی رات ملک سے چلی گئی اور بیس برس سے قبل نہیں لوٹی، شادی شدہ اور سات بچوں کے ساتھ جو میرے ہوسکتے تھے۔

اپنی سماجی توہین کے بعد "ایل دیاریو دِ لَپاس" میں میرے لیے اپنا مقام اور کالم باقی رکھنا مشکل ہو گیا۔ لیکن میرے کالم کو گیارہویں صفحے پر بھجوادینے کی، بہرحال، یہ وجہ نہیں تھی، بلکہ وہ اندھی قوتِ محرکہ تھی جس کے ساتھ بیسویں صدی منظر پر آئی تھی۔ پیش رفت شہر کا رمزیہ بن گئی۔ ہر شے بدل گئی؛ ہوائی جہاز اڑنے لگے، اور کسی بیوپاری نے خطوں سے بھرا بورا جنکر کے باہر اچھال دیا اور یوں ہوائی ڈاک ایجاد کرڈالی۔

اپنی سابق حالت پر باقی رہ جانے والی واحد چیز میرے اخباری کالم تھے۔ نوجوان نسلوں نے ان کے خلاف یوں دھاوا بول دیا جیسے وہ ماضی کی کسی حنوط شدہ لاش پر حملہ آور ہوں جس کو تباہ کرنا از بس ضروری ہو، لیکن میں نے اپنا شعار قائم رکھا اور تجدّد کی ہواؤں کی ذرا رورعایت نہیں کی۔ میں نے ہر شے سے صَرفِ نظر کی۔ میں چالیس سال کا ہو چکا تھا، لیکن عملے کے نوخیز لکھنے والوں نے اس کا نام مُدَرّا حرامی کا کالم رکھ دیا۔ اس وقت جو شخص ایڈیٹر تھا اس نے مجھے اپنے دفتر کے اندر بلا بھیجا اور تازہ بتازہ لہروں سے مطابقت پیدا کرنے کی تلقین کی۔ بڑے گمبھیر انداز میں، جیسے اسے ابھی ابھی یہ خیال آیا ہو، وہ بولا: دنیا آگے جارہی ہے۔ ہاں، میں نے کہا، یہ آگے جارہی ہے، لیکن یہ سورج کے گرد ہی گردش کررہی ہے۔ اس نے میرے اتواری کالم کو باقی رہنے دیا کیونکہ اسے کوئی اور کیبل ایڈیٹر نہیں مل سکتا تھا۔ آج مجھے معلوم ہے کہ میں صحیح تھا، اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کیوں۔ میری نسل کے نوجوان، جو زندگی کے حریص تھے، مستقبل کی بابت اپنی امیدوں کو جسم و جاں دونوں میں بھلا بیٹھے تھے تا آنکہ حقیقت نے انھیں سکھایا کہ یومِ آئندہ وہ نہیں تھا جس کا خواب انھوں نے دیکھا تھا، اور انھوں نے ناسٹلجیا دریافت کرڈالا۔ میرے اتواری کالم وہاں موجود ہی تھے، ماضی کے خرابات میں کسی قدیم آثار

کی طرح، اور انھیں یہ احساس ہوا کہ یہ صرف پرانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ ان جوانوں کے لیے بھی ہیں جو افزائشِ عمر سے خائف نہیں۔ تب کالم ایڈیٹوریل والے حصے میں لوٹ آیا اور، خاص موقعوں پر، صفحۂ اوّل پر۔

جب کوئی مجھ سے پوچھتا ہے تو میں ہمیشہ بالکل سچ جواب دیتا ہوں: رنڈیوں نے مہلت ہی نہ دی کہ شادی کرتا۔ پھر بھی، مجھے یہ اعتراف ضرور کرنا چاہیے کہ یہ وضاحت مجھے اپنی نوّے ویں سالگرہ کے دن سے پہلے نہیں سجھائی دی، جب میں اس عزم کے ساتھ روسا کبرکس کے مکان سے نکلا کہ دوبارہ کبھی قسمت کو نہیں للکاروں گا۔ میں نے اپنے کو ایک بالکل دوسرا آدمی محسوس کیا۔ میرا مزاج اس بدنام ہجوم سے ابتر ہو گیا جسے میں نے پارک کے گردا گرد لگی دہاتی ریلنگز سے ٹیک لگائے دیکھا۔ میں نے دَمیانہ کو دیکھا کہ بیٹھک کے فرش پر ہاتھ اور پاؤں کے بَل جھکی اسے دھو دھا رہی ہے، اور اس عمر میں اس کی رانوں کی جوان توانائی نے کسی اور وقت کی لرزش کو مجھ میں جگا دیا۔ اس نے اس کا احساس کر لیا ہوگا کیونکہ اس نے خود کو اپنے اسکرٹ سے ڈھک لیا۔ میں یہ پوچھنے کی ترغیب پر قابو نہ پا سکا: دَمیانہ، بتاؤ، تمھیں کیا یاد آتا ہے؟ میں کچھ یاد واد نہیں کر رہی تھی، وہ بولی، لیکن تمھارا سوال مجھے یاد دلاتا ہے۔ مجھے اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔ میں محبت میں کبھی گرفتار نہیں ہوا ہوں، میں نے اسے بتایا۔ لیکن اس نے بلا جھجھک کہا: میں ہوئی ہوں۔ اور اس نے اختتاماً کہا، بغیر اپنے کام میں خلل اندازی کیے: میں تمھارے لیے بائیس سال تک روتی رہی ہوں۔ میرے دل کی دھڑکن رک گئی۔ باعزت طور پر نکلنے کی راہ تلاش کرتے ہوے میں نے کہا: ہم اچھا جوڑا ہوتے۔ حد ہو گئی، اب تمھارا یہ کہنا مناسب نہیں، وہ بولی، دلاسے کے طور پر بھی اب تم میرے لائق نہیں۔ جب وہ گھر سے نکل رہی تھی، اس نے حد درجہ فطری انداز میں کہا: کہوں گی تو تم یقین نہیں کرو گے لیکن خدا کا شکر، میں ابھی تک باکرہ ہوں۔

کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ گھر میں جا بجا سرخ گلابوں سے بھرے گلدان رکھ گئی ہے، اور میرے تکیے پر ایک کارڈ: دعا کرتی ہوں کہ تم سو سال کو پہنچو۔ منھ میں یہ بد

ذائقہ لیے میں وہ کالم ختم کرنے بیٹھ گیا جسے پچھلے دن آدھا لکھا چھوڑ دیا تھا۔ میں بغیر رکے لکھتا رہا اور دو گھنٹے سے کچھ کم میں اسے نمٹا دیا۔ اس میں مجھے، بقول میکسیکن شاعر، ''راج ہنس کی گردن مڑوڑنی پڑی،'' یعنی اپنے دل میں ڈوب کر لکھا اور کسی کی نظر اپنے آنسوؤں پر نہیں پڑنے دی۔ آمد کے ایک دیر آمدہ لمحے میں، میں نے اس کو اس اعلان کے ساتھ ختم کرنے کا فیصلہ کیا کہ اس کالم کے ساتھ میں ایک طویل اور باعزت زندگی کو مسرت بخش انجام تک پہنچا رہا ہوں، موت کی قابلِ افسوس ضرورت کے بغیر۔

میری نیت تھی کہ اس کو اخبار کے استقبالیے کے حوالے کر کے گھر لوٹ آؤں گا۔ لیکن یہ کر نہ سکا۔ سارا عملہ میری سالگرہ منانے کا انتظار کر رہا تھا۔ عمارت کی تجدید ہو رہی تھی، ہر جگہ مچانیں کھڑی تھیں اور ملبہ پڑا تھا، تاہم انھوں نے تقریب کے واسطے کام روک دیا تھا۔ ایک بڑھئی کی میز پر تحائفی کاغذ میں لپٹے سالگرہ کے نذرانے اور جام صحت نوش کرنے کے واسطے پینے پلانے کی چیزیں رکھی تھیں۔ کوندتے کیمروں کی چکاچوند سے گم سم، مجھے ہر تصویر میں شامل کیا گیا جسے یادگار کے طور پر اتارا گیا۔

مجھے شہر کے ریڈیو کے خبریں پڑھنے والوں اور دوسرے اخباروں کے رپورٹروں کو دیکھ کر مسرت ہوئی: "لا پرینسا،" صبح کا قدامت پسند اخبار، "ایل اِرالدو،" صبح کا آزاد خیال اخبار، اور "ایل ناسیونال،" شام کا سنسنی خیز ٹیبلوائڈ جس کا کام ہیجانی جذبات والی قسط وار کہانیوں کی پیشکش سے ہمیشہ عوام کے طبقے کی تشنجی کیفیت کو آسودہ کرنے کی کوشش تھا۔ یہ تعجب کی بات نہیں تھی کہ یہ سب ایک ساتھ تھے، کیونکہ روحِ شہر میں ہمیشہ یہ وضع اچھی سمجھی جاتی تھی کہ فوجی دستوں میں دوستیاں قائم رہیں جب کہ افسران ایڈیٹوریل جنگیں جاری رکھیں۔

سرکاری محتسب ڈان خرونیمو اور تیگا بھی موجود تھا، گو یہ اس کے وہاں ہونے کا وقت نہیں تھا۔ اسے ہم لعنتی مردِ معدوم کہتے تھے کیونکہ وہ ہر رات ٹھیک نو بجے اپنی رجعت پسند صوبے دار کی لہو رنگ پینسل سنبھالے وارد ہوتا اور اس وقت تک براجمان رہتا جب تک یہ یقین نہ کر لیتا کہ صبح کے ایڈیشن میں چھپنے والے ہر خط کی درگت بن گئی ہے۔ مجھ سے اسے ذاتی طور پر چڑ

تھی، شاید اس کی وجہ میری ماہرِ قواعد ولسانیات کی اتراہٹ ہو، یا یہ کہ میں اطالوی الفاظ استعمال بغیر واوین یا اٹیلکس کے کرتا تھا اس وقت جب وہ مجھے ہسپانوی سے زیادہ مؤثر معلو ہوتے، جسے بہرحال جڑواں زبانوں کے درمیان ایک بالکل جائز معمول ہونا چاہیے۔ چار سال تک اسے جھیلنے کے بعد، ہم نے آخر کار اسے اپنے بدضمیر کے طور پر قبول کرلیا تھا۔

سیکریٹریز ایک کیک لے کر آئیں جس پر فروزاں نوّے موم بتّیوں نے پہلی بار مجھے اپ عمر کے سالوں کے روبرو کردیا۔ جب انھوں نے سالگرہ کا گانا گایا مجھے اپنے آنسو روکنے گئے، اور مطلق بغیر کسی وجہ کے مجھے لڑکی کا خیال آ گیا۔ یہ بغض کا نہیں بلکہ ایک ایسی مخلوق کے لیے ترحّم کا کوندا تھا جس کے بارے میں کبھی سوچنے کی مجھے توقع نہیں تھی۔ جب لمحہ رفت گزشت ہوا تو کسی نے میرے ہاتھ میں چھری پکڑا دی تا کہ کیک کاٹ سکوں۔ سبکی ہونے کے خیال سے کسی نے فوری تقریر جھاڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ ایسی تقریر کا جواب دینے سے بہتر میں مرجانا سمجھتا تھا۔ تقریب کو ختم کرتے ہوئے مدیرِ اعلیٰ، جو مجھے کبھی بہت زیادہ نہیں بھا تھا، ہمیں واپس ناخوشگوار حقیقت کی طرف لوٹا لایا۔ اور اب، ممتاز نوّے سالہ، اس نے مجھ سے کہا: تمھارا کالم کہاں ہے؟

سچ تو یہ ہے کہ اس ساری دوپہر یہ مجھے اپنی جیب میں انگارے کی طرح سلگتا ہوا محسوس ہوا تھا، لیکن جذبات نے مجھے اتنے گہرے طور پر برما دیا تھا کہ بن نہ پڑی کہ استعفا پیش کر کے تقریب کا مزہ کرکرا کردوں۔ میں نے کہا: اس موقعے پر کوئی نہیں ہے۔ مدیرِ اعلیٰ اس کوتاہی پر جزبز ہوا جس کا پچھلی صدی سے تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سمجھیے ایسا ایک ہی بار ہوا ہے، میں نے کہا، رات اتنی بری کٹی ہے کہ ایک بار تو میں حواس باختہ ہوکر اٹھ پڑا تھا۔ اچھا، پھر تو تمھیں اِسی کے بارے میں لکھنا چاہیے تھا، وہ بولا، مذاقاً، جس میں سرکے کی ترشی تھی۔ قارئین براہ راست جاننا چاہتے ہیں کہ نوّے برس کی عمر میں زندگی کس ڈھب کی ہوتی ہے۔ سکریٹیریوں میں کی ایک بیچ میں آ گئی۔ ہو نہ ہو بڑا مزے دار راز ہوگا، وہ بولی اور میری طرف شرارت سے دیکھا۔ نہیں؟ ایک شعلہ سا میرے چہرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لپک گیا۔

لعنت بھیجو، میں نے سوچا، شرمانا کس قدر بے وفا ہے۔ ایک اور جھمکتی سیکریٹری نے اپنی انگلی سے میری طرف اشارہ کیا۔ ماشا اللہ! تم اب بھی نفاست سے شرما سکتے ہو۔ اس کی شوخ چشمی نے ایک اور شرماہٹ کو ابھارا۔ بڑی زبردست رات رہی ہوگی، پہلی سیکریٹری نے کہا: مجھے تم پر کتنا رشک آتا ہے! اور اس نے میرا بوسہ لے لیا جو گال پر اپنا رنگین نشان چھوڑ گیا۔ تصویریں بے رحم تھیں۔ ہکا بکا، میں نے کالم ایڈیٹر ان چیف کے حوالے کیا اور کہا کہ جو پہلے کہا تھا محض مذاق تھا، یہ رہا، اور میں بھاگ نکلا، ستائشی تالیوں کے آخری دورے سے بدحواس، تاکہ جب انھیں پتا چلے کہ نصف صدی کے کچے پروف پڑھنے کے بعد یہ میرا استعفا ہے تو میں وہاں موجود نہ ہوں۔

اس رات گھر پر تحائف کھولتے وقت مجھے ہنوز دھڑکا لگا ہوا تھا۔ لائنو ٹائپسٹ نے الیکٹرک کوفی پاٹ دینے میں غلطی کی تھی جو ان تینوں جیسا ہی تھا جو مجھے گزشتہ سالگراہوں پر ملے تھے۔ ٹائپوگرافرس نے مجھے جانوروں کے بلدیاتی دارالامان سے ایک انگورا بلّی لینے کا اختیارنامہ دیا تھا۔ انتظامیے نے مجھے ایک علامتی بونس عطا کیا تھا۔ سیکریٹریوں نے مجھے تین جوڑی ریشمیں زیر جامے پیش کیے تھے جن پر بوسوں کی چھاپ تھی، اور ایک کارڈ پر اگر چاہوں تو ان کو ہٹا دینے کی پیشکش۔ مجھے خیال آیا کہ بڑھاپے کے افسوں میں وہ اکساہٹیں بھی شامل ہیں جو ہماری نوجوان زنانہ دوست اپنے لیے روا رکھتی ہیں کیونکہ سوچتی ہیں کہ اب ہم کام کے نہیں رہے۔

میں کبھی یہ دریافت نہ کرسکا کے مجھے استیفان اَسکیناسی کا بجایا ہوا شوپیں کی چوبیس ''پرِلیوڈس'' والا رکارڈ کیسے حاصل ہوا تھا۔ بیشتر ادیب مجھے سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں دیتے تھے۔ میں نے ابھی تحفے کھولنا ختم نہیں کیا تھا کہ روسا کبرکس نے ایک سوال پوچھنے کے لیے فون کیا جو میں سننا بھی نہیں چاہتا تھا: لڑکی کے ساتھ تمھیں کیا پیش آیا؟ کچھ نہیں، میں نے بغیر سوچے کہہ دیا۔ تم نے اسے جگایا تک نہیں، یہ کوئی بات ہی نہیں تمھارے خیال میں؟ روسا کبرکس نے کہا۔ عورت کبھی اس آدمی کو معاف نہیں کرتی جو اُس کی بسم اللہ کی اس طرح توہین

کرتا ہے۔ میں نے حجت کی کہ لڑکی صرف بٹن ٹانکنے کی وجہ سے اتنی نڈھال نہیں ہوگی، اور شا
اُس پُرخطر لمحے کے خوف سے سونے کا سوانگ رچائے ہو۔ گمبھیر ترین بات یہ ہے، روسا
کہا، کہ وہ سچ مچ یہی سمجھتی ہے کہ تم اب اور اس کے قابل نہیں رہے، اور میں یہ نہیں چاہتی کہ
اس بات کے چرچے کرتی پھرے۔

میں نے اسے تعجب کے اظہار کی تسکین کا موقع نہیں دیا۔ اگر ایسا ہو بھی تو، میں نے کہا
اس کی حالت اتنی افسوس ناک ہے کہ سوتے جاگتے کسی بھی حالت میں اس پر بھروسا نہیں
جاسکتا: وہ ہسپتال میں بھرتی کرنے کے لائق ہے۔ روسا کبَرکَس نے آواز مدھم کردی: جر
اتاولے پن میں معاملہ پٹا تھا، سارا کیا کرایا اسی کا ہے، لیکن تدارک ہوسکتا ہے، تم دیکھنا۔ اا
نے لڑکی سے اعتراف اگلوانے کا وعدہ کیا، اور اگر مناسب ہوا تو اس سے رقم واپس نکلوانے
بھی، کیا خیال ہے؟ جانے دو، میں نے کہا، کچھ نہیں ہوا، حقیقت یہ ہے کہ اس نے مجھ پر وا
کردیا کہ میری حالت ایسی بالکل نہیں کہ لونڈیوں کے پیچھے بھاگتا پھروں۔ اور اس حساب سے
لڑکی نے درست ہی کہا تھا: میں اب اور اس کے قابل نہیں رہا۔ میں نے فون بند کردیا، آزاد
کے ایک ایسے احساس سے لبریز جس سے زندگی میں پہلے کبھی واقف نہیں رہا تھا، اور انتہائے کا
اس محکومیت سے آزاد جس نے مجھے تیرہ سال کی عمر سے پابہ زنجیر رکھا تھا۔

اُس شام سات بجے میں بے لیاس آرٹس میں ژاک تھبو اور الفریڈ کورتو کے پیش کرد
کنسرٹ میں مہمانِ خصوصی تھا، جن کی سے زار فرانک کی Sonata for Violin and
Piano کی ترجمانی بڑی شان دار تھی، اور انٹرول کے دوران میں نے اس کی بعید از امکان
تعریف و تحسین ہوتے سنی۔ مائسترو پیدرو بیاوا، ہمارا لحیم شحیم موسیقار، مجھے تقریباً گھسیٹتا ہو
ڈریسنگ رومز میں سولوئسٹس سے ملوانے لایا۔ میں اتنا حواس باختہ تھا کہ انھیں شومان کی سونا
بجانے پر مبارک باد دے ڈالی، اور سامعین میں سے کسی نے بڑے ناگوار انداز میں میری تصحیح
کی۔ یہ تأثر کہ میں نے دونوں سوناٹاؤں کو محض لاعلمی کے باعث خلط ملط کردیا تھا، مقا
منظرِ موسیقی پر خوب خوب اچھالا گیا اور اسے میری اس وضاحت نے جو میں نے تصحیح کے طور

اگلے اتوار کو کنسرٹ کی بابت اپنے تبصرے میں پیش کی اور بھی مغلق بنا دیا۔

اپنی طویل زندگی میں پہلی بار مجھے لگا کہ میں کسی کو قتل کرسکتا ہوں۔ میں اس حال میں گھر لوٹا کہ وہ چھوٹا سا شیطان مجھے مسلسل اذیّت پہنچا رہا تھا جو ہمارے کانوں میں ان غارت گر جوابوں کی سرگوشی کرتا ہے جو ہم نے صحیح وقت پر نہیں دیے ہوتے، اور میری برہمی مطالعے سے فرو ہوئی نہ موسیقی سے۔ یہ خوش قسمتی تھی کہ روسا کبرکس نے فون میں چلّا کر مجھے میری دیوانگی سے باہر نکالا: مجھے اخبار دیکھ کر خوشی ہوئی کیونکہ میرا خیال تھا کہ تم سو سال کے ہو رہے ہو، نوے کے نہیں۔ میں نے طیش میں آ کر کہا: کیا میں تمھیں اتنا ہی گلجھٹی (فلگڈ اَپ) نظر آتا ہوں؟ ہرگز نہیں، وہ بولی، مجھے حیرت تو اس پر ہوئی کہ اتنے ٹھیک ٹھاک نظر آ رہے ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم ان غلیظ بڈھوں میں سے نہیں جو اپنی عمر زیادہ بتاتے ہیں تاکہ لوگ سمجھیں کہ اچھی حالت میں ہیں۔ بنا گریز کے اس نے موضوع بدل دیا: تمھارا تحفہ میرے پاس ہے۔ میں، حقیقت میں، حیرت زدہ ہو گیا: کیا تحفہ ہے؟ لڑکی، وہ بولی۔

اس کی بابت سوچنے میں مجھے ایک ثانیہ بھی نہیں لگا۔ شکریہ، میں نے کہا، مگر یہ تو رفت و گزشت بات ہے۔ وہ بغیر رکے بولے گئی: میں اسے تمھارے گھر بھیج دوں گی، انڈیا پیپر میں لپٹی لپٹائی اور ڈبل بوئلر میں صندل میں کھدبداتی ہوئی، بالکل مفت۔ لیکن میں اپنی بات پر اَڑا رہا، اور اس نے جتنا جو وضاحت پیش کی وہ اپنی سنگینی کے باوجود مخلصانہ بھی تھی۔ اس نے بتایا کہ جمعے کے دن لڑکی کی حالت اتنی بری اس لیے تھی کہ اس نے سوئی اور انگشتانے سے دو سو بٹن ٹانکے تھے۔ اور یہ درست ہے کہ اسے خونین تحریمات کا بھی خوف تھا لیکن اسے قربانی کی بابت پہلے سے متنبہ کر دیا گیا تھا۔ اور ہماری باہمی شب کے دوران وہ اُٹھ کر غسل خانے گئی تھی، اور میں اتنی گہری نیند سو رہا تھا کہ اسے یہ باعثِ شرم لگا کہ مجھے بیدار کرے، لیکن صبح جب وہ دوبارہ اُٹھی تو میں جا چکا تھا۔ میں اس فضول دروغ گوئی پر برہم ہوا۔ خیر، روسا کبرکس بولے گئی، اگر یہ صحیح بھی ہو، لڑکی بہرحال مت اُسف ہے۔ بے چاری، وہ یہاں بالکل میرے سامنے ہے۔ تم اس سے بات کرو گے؟ نہیں، خدا کے واسطے، میں نے کہا۔

میں نے لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ اخبار سے سیکریٹری کا فون آیا۔ پیغام یہ تھا کہ ایڈیٹر نے اگلے دن صبح گیارہ بجے مجھے آنے کے لیے کہا ہے۔ میں ٹھیک وقت پر پہنچ گیا۔ تجدیدات کا شوروشغب قابلِ برداشت نہیں لگا، فضا ہتھوڑوں، سیمنٹ کی گرد، اور کول تار سے اٹھتی ہوئی بھاپ سے رقیق تھی، لیکن ایڈیٹوریل روم میں انھوں نے اس بندھے ٹکے انتشار میں غوروفکر کرنا سیکھ لیا تھا۔ دوسری طرف، ایڈیٹر کے دفاتر، سرد اور پُرسکوت، گویا ایک ایسی دنیا میں واقع تھے جو ہماری نہیں تھی۔

تیسرا مارکوتُلیو، اپنی نوجوانی کی ادا کے ساتھ، مجھے آتے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا لیکن اپنے ٹیلیفونی گفتگو میں رخنہ نہیں پڑنے دیا، ڈیسک پر سے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ ملایا، اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مجھے لگا کہ لائن کی دوسری طرف کوئی نہیں ہے، اور وہ صرف مجھ پر رعب ڈالنے کے لیے سوانگ رچا رہا ہے، لیکن مجھے جلد ہی پتا چل گیا کہ وہ گورنر سے محوِ کلام تھا اور کہ یہ دو قلبی دشمنوں کے درمیان ایک دقّت طلب مکالمہ تھا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میری موجودگی میں وہ خود کو ہٹا کٹا ظاہر کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا، گو عہدے دار سے گفتگو کے دوران وہ کھڑا ہی رہا۔

اس میں چست اور خوش لباس نظر آنے کا نمایاں عیب تھا۔ بالکل حال ہی میں وہ انتیس سال کا ہوا تھا، چار زبانیں جانتا تھا اور باہر کے ملکوں سے تین ایم۔ اے۔ کے سندنامے لے چکا تھا، پہلے تادمِ حیات صدر کے برخلاف، جو اس کا دادا تھا، اور جو ایک سفید فام بردہ داری سے بے حد و انداز دولت سمیٹنے کے بعد ایک مشاہداتی صحافی بن گیا تھا۔ وہ شائستہ آداب، غیر معمولی حسن اور اچھے رکھ رکھاؤ کا مالک تھا، اور بس ایک ہی چیز جو اس کے امتیاز میں کھنڈت ڈالتی تھی وہ اس کی آواز کا خفیف سا جعلی پن تھا۔ وہ ایک اسپورٹس جیکٹ پہنے ہوئے تھا جس کے گریبان کے کاج میں آرکڈ کا تازہ پھول اُڑسا ہوا تھا، اور لباس کی ہر چیز اس پر یوں خوش آتی تھی جیسے اس کے وجود کا فطری حصہ ہو، لیکن ان میں کی ہر چیز گلی کوچوں کی آب و ہوا کے لیے نہیں بنی تھی بلکہ صرف اس کے دفتروں کے موسمِ بہار کے لیے۔ میں نے، وہ جس نے کپڑے پہننے میں تقریباً دو گھنٹے لگائے تھے، مفلسی کی ذلت کو محسوس کیا، اور میری برافروختگی بڑھ گئی۔

اس کے باوجود، جان لیوا زہر تو اخبار کی بنیاد پڑنے کی پچیسویں سالگرہ کے موقعے پر کھینچی گئی عملے کی وسیع المنظر تصویر میں پڑا ہوا تھا جس میں مرنے والوں کے سروں پر صلیب کا چھوٹا سا نشان بنا دیا گیا تھا۔ میں دائیں سے تیسرا تھا، پھونس کا چپٹے سر والا حاشیہ دار ٹوپ (straw boater) پہنے، بڑی سی گرہ والی ٹائی لگائے جس میں ٹائی پن بھی لگی ہوئی تھی، اپنی پہلے پہل کی شہری کرنل جیسی مونچھوں میں، جو میں نے چالیس سال کی عمر تک رکھیں، اور کسی مذہبی درس گاہ کے رکن کی جیسی دہاتی حلقوں والی عینک چڑھائے جس کے استعمال کی ضرورت سے میں پچاس سال بعد آزاد ہوگیا تھا۔ برسوں تک میں اس تصویر کو مختلف دفتروں میں آویزاں دیکھتا آیا تھا، لیکن بس اِسی وقت ہی اس کے درپردہ پیغام سے واقف ہوا: اوّلین اڑتالیس تنخواہ داروں میں سے اب صرف چار ہی زندہ تھے، اور عمر میں ہم میں کا سب سے چھوٹا کئی آدمیوں کے قتل کی پاداش میں بیس سال کی قید بھگت رہا تھا۔

ایڈیٹر نے فون پر گفتگو ختم کی، مجھے تصویر کو گھورتے ہوئے دیکھا، اور مسکرایا۔ صلیب کے یہ نشان میں نے نہیں لگائے ہیں، وہ بولا۔ میں انھیں بڑی بدمذاقی سمجھتا ہوں۔ وہ اپنی ڈیسک کے پیچھے بیٹھ گیا اور اپنا لہجہ بدل دیا: مجھے یہ کہنے کی اجازت دو کہ جتنے لوگوں سے میں اب تک ملا ہوں تم ان میں سب سے زیادہ غیر متوقع ڈھب کے ہو۔ اور مجھے متعجب دیکھ کر اس نے میرے جواب کا اندازہ کرلیا: میں یہ تمھارے استعفےٰ کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔ میں نے کسی نہ کسی طرح یہ کہہ ہی دیا: یہ ایک پوری کی پوری زندگی ہے۔ اس نے جواب میں کہا کہ صرف اسی وجہ سے یہ کوئی مناسب حل نہیں۔ اس کی نظر میں کالم بے حد شاندار تھا، اس میں کہولت کی بابت جو کچھ کہا گیا تھا اس سے بہتر اس نے پہلے کبھی نہیں پڑھا تھا، اور اس کو ایک ایسے فیصلے کے ساتھ ختم کردینا جو شہری موت کے مترادف ہے ایک بالکل ناقابلِ فہم بات ہے۔ اسے خوش قسمتی ہی کہنا چاہیے، اس نے بتایا، کہ لعنتی مردِ معدوم کے مضمون پڑھنے اور ناقابلِ قبول قرار دینے سے پہلے ہی ایڈیٹوریل پیج تیار ہوچکا تھا۔ کسی سے صلاح مشورہ کیے بغیر ہی اس نے اس پر اوپر سے نیچے تک اپنی تورکیادا کی پینسل سے خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ آج صبح جب یہ بات میرے

علم میں آئی تو میں نے ایک احتجاجی نوٹ حکومت کو بھجوا دیا۔ یہ میرا فرض تھا، تاہم رازدارانہ طور پر، میں کہہ سکتا ہوں کے سینسر کی اس من مانی کا بے حد شکرگزار ہوں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ میں کالم کے انقطاع کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں اپنی روح و جان سے تم سے درخواست کرتا ہوں، وہ بولا۔ کشتی بیچ سمندر میں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ اور اس نے بڑے شان دار انداز میں اپنی بات ختم کی: موسیقی کے بارے میں بات کرنے کے لیے ہمارے پاس بہت کچھ باقی ہے۔

وہ اس قدر پُرعزم نظر آیا کہ توڑ کے طور پر جوابی دلیل دے کر اپنے باہمی اختلاف کو بدتر بنا دینے کی مجھے ہمت نہیں ہوئی۔ فی الواقع، ساری مشکل یہ تھی کہ اِس موقعے پر بھی زندگی کے اکتا دینے والے ڈھرّے سے رسّی تڑانے کی مجھے کوئی معقول وجہ نہیں ملی، اور محض تھوڑی سی مہلت پالینے کے لیے اس سے ایک بار پھر ہاں کرنے کے خیال نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ مجھے باقاعدہ خود کو قابو میں رکھنا پڑا مبادا وہ اس باعثِ شرم جذبے کو تاڑ جائے جس کے وجہ سے میری آنکھیں ڈبڈبانے لگی تھیں۔ پھر یہ بھی کہ ہمیشہ کی طرح، اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی، ہم ہنوز اسی جگہ تھے جہاں ہمیشہ رہے تھے۔

اگلے ہفتے، جو ایک ایسی کیفیت کا شکار تھا جو مسرت کے مقابلے میں الجھن سے زیادہ قریب تھی، میں پرنٹرز کی تحفتاً دی گئی بلّی کو لینے جانوروں کی پناہ گاہ کے پاس سے گزرا۔ میرے کیمیائی عناصر جانوروں سے میل نہیں رکھتے، بالکل جس طرح بچوں سے جب ابھی انھوں نے بولنا شروع نہیں کیا ہوتا۔ یہ اپنی ارواح میں گونگے لگتے ہیں۔ میں ان سے نفرت نہیں کرتا، لیکن میں انھیں برداشت نہیں کرسکتا، کیونکہ میں ان سے معاملہ کرنے کا سبق کبھی سیکھ ہی نہیں سکا۔ میرا خیال ہے یہ آدمی کی فطرت کے خلاف ہے کہ وہ اپنی بیوی کے مقابلے میں اپنے کتّے سے بہتر سلوک کرے، اسے وقت پر کھانا کھانا اور رفعِ حاجت کرنا سکھائے، اس کے سوالوں کا جواب دے اور اس کے رنج و محن میں اس کا شریک ہو۔ لیکن ٹائپوگرافرز کی دی ہوئی بلّی کو نہ اٹھانا ان کی ہتک کرنے کے برابر ہوتا۔ علاوہ برایں، وہ انگورا نسل کا بے حد حسین نمونہ تھی، سمور چمک

دار، گلابی رنگ کا، جگمگاتی آنکھیں، اور میاؤں جو لگتا تھا الفاظ بننے کے قریب ہوں۔ بلّی انھوں نے بید کی ٹوکری میں میرے حوالے کی، ایک صداقت نامے، جس میں اس کا شجرۂ نسب درج تھا، اور مالک کے لیے ایک ہدایت نامے کے ساتھ، جیسا بائیسکلوں کے انفرادی پرزوں کو جوڑنے کے واسطے ہوتا ہے۔

ایک ملٹری پہرہ سن نِکولاس پارک میں داخلے سے پہلے راہ گیروں کی شناختی جانچ پڑتال کررہا تھا۔ ایسی واردات میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور اپنی پیرانہ سالی کی علامت کے طور پر اس سے زیادہ حوصلہ شکن کسی اور چیز کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ یہ چار افراد پر مشتمل پہرہ تھا، ایسے آفیسر کے ماتحت جو تقریباً نوخیز تھا۔ سپاہی پہاڑی، بنجر علاقوں کے باشندے تھے، جفاکش، خاموش طبیعتوں کے آدمی جن سے اصطبل کی بو آتی تھی۔ آفیسر ان سب کو، جن کے رخسار ریتیلے ساحلوں کے اینڈینس (Andeans) جیسے چمک دار سرخ تھے، اپنی چشمِ نگراں کے حلقے میں لیے ہوے تھا۔ میرے شناختی کاغذات اور پریس کارڈ کے معائنے کے بعد، اس نے پوچھا کہ ٹوکری میں کیا لے جارہا تھا۔ بلّی، میں نے اسے بتایا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے جس قدر احتیاط سے ہوسکا، کہ کہیں فرار نہ ہوجائے، ٹوکری کا منھ کھولا، لیکن ایک سپاہی دیکھنا چاہتا تھا کہ پینیدے میں کچھ اور تو نہیں، اور بلّی نے اس کے خراش ڈال دی۔ آفیسر نے مداخلت کی۔ انگورا بلّیوں میں ہیرا ہے، وہ بولا۔ بلّی کو پیار سے تھپتھپایا اور بڑبڑا کر کچھ کہا، اور بلّی نہ اس پر حملہ آور ہوئی اور نہ اسے کسی خاطر ہی میں لائی۔ کیا عمر ہوگی اس کی؟ اس نے پوچھا۔ مجھے معلوم نہیں، میں نے کہا، بس ابھی ابھی یہ مجھے ملی ہے۔ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ تم خود دیکھ سکتے ہو کہ یہ کافی عمر رسیدہ ہے، شاید دس سال بھر بوڑھی۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ اسے کیسے معلوم ہوا، اور دوسری باتیں بھی، لیکن اس کے شائستہ آداب اور مرصّع کلامی کے باوجود مجھ میں اس سے بات کرنے کی تاب نہیں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ واماندہ بلّی ہے جس نے بہت کچھ جھیلا ہے، اس نے کہا۔ بس اس کا مشاہدہ کیا کرو، اسے اپنے موافق مت بنانا، بلکہ اس کے حساب سے خود کو ڈھالنا، اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دینا تا آنکہ تمھیں اس کا اعتماد حاصل ہوجائے۔

اس نے ٹوکری کا ڈھکنا بند کر دیا اور پوچھا: تم کس قسم کا کام کرتے ہو؟ میں صحافی ہوں۔ کب سے؟ ایک صدی سے، میں نے بتایا۔ اس میں مجھے شک نہیں، وہ بولا۔ اس نے ہاتھ ملا کر ایک جملے کے ساتھ خدا حافظ کہا، یہ جملہ اچھا مشورہ بھی ہو سکتا تھا یا دھمکی بھی:

''اپنا خوب خیال رکھنا۔''

دوپہر کے وقت میں نے موسیقی کے ایک بڑے نادر پروگرام میں پناہ لینے کی خاطر فون منقطع کر دیا: واگنر کی Rhapsody for Clarinet and Orechestra، دیبیوسی کی Rhapsody for Saxophone، اور بُرکنر کا String Quintet، جو اس کی دہشت ناک شورش سے پُرتخلیقات میں ایک بہشتی ریگستان کی طرح ہے۔ اور اچانک میں نے خود کو اپنی مطالعہ گاہ کی تاریکی میں گھرا پایا۔ میز کے نیچے مجھے کوئی شے تیزی سے پھسلتی ہوئی محسوس ہوئی جو کوئی ذی روح نہیں معلوم ہوتی تھی بلکہ کوئی مافوق الفطرت موجودگی جو میرے پاؤں سے چُھلتی ہوئی جارہی ہو، اور میں ایک چیخ کے ساتھ اچھل پڑا۔ یہ بلّی تھی، اپنی خوب صورت پُرنما دم، پُراسرار ماندگی، اور اسطوری حسب ونسب کے ساتھ، اور میں گھر میں ایک ایسی جان دار ہستی کے ساتھ جو انسان نہیں تھی تنہا ہونے پر کپکپائے بغیر نہ رہ سکا۔

جب گرجے نے سات بجائے، اس وقت آسمان میں گلابی رنگ کا ایک تنہا، پُرسکون ستارہ تھا، ایک جہاز نے غم زدہ سی الوداعی سیٹی بجادی، اور مجھے اپنے حلق میں ان تمام محبتوں کی پیچیدہ گرہ محسوس ہوئی جو کی جاسکتی تھیں اور نہیں کی گئیں۔ میں اور زیادہ برداشت نہیں کر سکا۔ میں نے انتہائی خوف کے ساتھ فون اٹھایا، بڑی آہستگی سے سوچ سوچ کر وہ چار نمبر ملائے تاکہ غلطی نہ کروں، اور تیسری گھنٹی کے بعد اس کی آواز پہچان لی۔ یوں ہی سہی، عورت، میں نے اطمینان کی لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا: میرے صبح والے غیظ وغضب سے درگزر کرو۔ وہ بالکل پُرسکون تھی: اس کا کچھ خیال نہ کرو، میں تمھاری کال کی متوقع تھی۔ میں نے اسے بتایا: میں چاہتا ہوں کہ لڑکی میرا انتظار اس حالت میں کرے جس میں خدا نے اسے اس دنیا میں بھیجا تھا، اور چہرے پر رنگ روغن کیے بغیر۔ وہ اپنی خرخراہٹ والی ہنسی ہنسی۔ جیسی جناب کی مرضی، اس نے

کہا، لیکن اس طرح تم اسے کپڑا کپڑا برہنہ کرنے کے لطف سے محروم رہ جاؤ گے، وہ چیز بوڑھے جسے کرنے کے بے حد مشتاق ہوتے ہیں، معلوم نہیں کیوں۔ مجھے معلوم ہے، میں بولا: کیونکہ وہ زیادہ سے زیادہ بوڑھے ہوتے جاتے ہیں۔ تو اس نے معاملہ طے سمجھا۔

''ٹھیک ہے،'' وہ بولی، ''تو آج رات ٹھیک دس بجے، اس سے قبل کہ اسے سرد پڑنے کا موقع ملے۔''

—۳—

بھلا اس کا کیا نام ہوگا؟ مالکہ نے مجھے بتایا نہیں تھا۔ جب اس کے بارے میں گفتگو کر رہی تھی تو بس اتنا کہا تھا: لڑکی، لَینینیا۔ اور میں نے اسے ذاتی نام میں بدل دیا تھا، جیسے میرے خوابوں کی دوشیزہ، یا کوتاہ ترین کریول کشتی۔ بنا برایں، روسا گبرکس اپنے اجیروں کا ہر گاہک کے واسطے ایک مختلف نام رکھتی تھی۔ میں ان کے چہروں سے ان کے نام کی قیاس آرائی کر کے تفریح لیا کرتا تھا، اور شروع ہی سے مجھے یقین تھا کہ لڑکی کا لمبا سا نام ہوگا، جیسے فِلومینہ، سَتورنینہ، یا نِکولاسا۔ میں ابھی اسی ادھیڑبن میں تھا کہ وہ بستر پر نصف کے قریب مڑی اور میری طرف اپنی پیٹھ کر کے پڑ گئی، اور ایسا معلوم ہوا جیسے اپنے پیچھے خون کی تلیا چھوڑ گئی ہو جو جسامت اور ہیئت میں اس کے جسم سے مشابہ ہو۔ مجھے لگنے والا دھچکا بالکل فوری تھا تا آنکہ میں نے اطمینان کرلیا کہ یہ چادر پر اس کے پسینے کی نمی تھی۔

روسا گبرکس نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ اس کے ساتھ احتیاط برتوں، کیونکہ اسے اپنی بارِ اوّل کی دہشت ابھی تک محسوس ہوتی تھی۔ یہی نہیں، مجھے یقین ہے کہ رسم کی گمبھیرتا نے اس کے خوف میں اضافہ کردیا تھا اور بالچھڑ کی خوراک بڑھانی پڑی ہوگی، کیونکہ وہ اتنے سکون سے

سو رہی تھی کہ بغیر کسی لوری کے اسے جگانا باعثِ شرم ہوتا۔ چنانچہ میں نے ایک تولیے سے اس کا جسم خشک کرنا شروع کیا اور دَیلگدینہ کی بابت گانا سرگوشیوں میں گاتا رہا، جو بادشاہ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی، اور جس سے خود اس کے باپ نے اظہارِ عشق کیا تھا۔ خشک کرنے کے درمیان وہ مجھے اپنا پسینے سے بھیگا ہوا پہلو میرے گیت کی تال پر دکھاتی رہی: دَیلگدینہ، دَیلگدینہ، تم میری جانی محبت ہوگی۔ یہ لذت کی انتہا تھی، کیونکہ میں نے ابھی اس کا ایک پہلو ہی خشک کیا تھا کہ دوسرا پھر پسینے سے تر ہوگیا، جس کا مطلب تھا کہ گانا شاید کبھی ختم نہ ہو۔ اٹھو، اٹھو، دَیلگدینہ، اور اپنا ریشمی سایہ پہن لو، میں نے اس کے کان میں گنگنایا۔ اختتام پر، جب بادشاہ کے خدام اسے اپنے بستر میں پیاس سے مردہ پاتے ہیں، مجھے لگا جیسے میری لڑکی نام سن کر بس اٹھنے ہی والی تھی۔ اچھا، تو یہی ہے وہ: دَیلگدینہ۔

میں اپنا زیر جامہ پہنے جس پر بوسے نقش تھے بستر پر لوٹ آیا اور اس کے برابر لیٹ گیا۔ اس کے تنفس کی لوری کی تال پر پانچ بجے تک سوتا رہا۔ میں نے بڑی عجلت سے لباس تبدیل کیا، بغیر منہ ہاتھ دھوئے، اور تب ہی کہیں میری نظر اس جملے پر پڑی جو سِنک کے اوپر آئینے پر لپسٹک سے لکھا ہوا تھا: **باگھ زیادہ دور نہیں کھاتا**۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ پچھلی رات وہاں نہیں تھا، اور کمرے میں کوئی دوسرا آ بھی نہیں سکتا تھا، چنانچہ میں نے اسے ہدیۂ شیطان جانا۔ دروازے کے قریب بجلی کے ایک ہیبت ناک تڑاکے نے مجھے ہکا بکا کردیا، اور کمرہ گیلی مٹی کی اندیشہ ناک مہک سے بھر گیا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ بچ کر بھاگ نکلوں۔ ٹیکسی پکڑنے سے قبل ایک بھاری مینھ نے مجھے آلیا، ویسا ہی مینھ جو مئی اور اکتوبر کے درمیان شہر کو افراتفری میں ڈال دیتا ہے، کیونکہ دریا کی طرف رواں جھلساتی ہوئی ریت کی سڑکیں اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو بہا لے جانے والے ریلوں کے باعث نالوں میں بدل جاتی ہیں۔ اس عجیب ستمبر، تین ماہ کی مسلسل یبوست کے بعد، یہ برسات اتنی ہی نعمتِ خداوندی ہوسکتی تھی جتنی تباہ کن۔

ٹھیک جس لمحے میں نے گھر کا دروازہ کھولا مجھے احساس ہوا کہ جسمانی طور پر میں تنہا

نہیں ہوں۔ صوفے سے چھلانگ لگا کر بالکنی کی طرف دوڑتی ہوئی بلّی کی مجھے جھلک سی نظر آئی۔ اس کی رکابی میں ایسے کھانے کی باقیات تھیں جو میں نے اسے نہیں دیا تھا۔ اس کے تیزابی پیشاب اور گرم گرم فضلے کی سڑاند نے ہر چیز کو آلودہ کر دیا تھا۔ میں نے اس کے مشاہدے میں خود کو اسی تندہی سے وقف کر دیا تھا جتنے لاطینی کے مطالعے میں۔ ہدایت نامہ کہتا تھا کہ بلّیاں اپنی لید کو چھپانے کے لیے فرش کو کھرچتی ہیں، اور ایسے گھر میں جس میں صحن نہ ہو، جیسا یہ گھر ہے، وہ گملوں یا کسی اور خفیہ جگہ میں کھرچیں گی۔ پہلے دن سے ہی یہ ضروری ہے کہ اس عادت کو صحیح ڈگر پر لگانے کے لیے انھیں ایک ریت بھرا ڈبّہ مہیا کر دیا جائے، جو میں نے کر دیا تھا۔ ہدایت نامہ یہ بھی کہتا ہے کہ نئے گھر میں بلّیوں کا اوّلین عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر جگہ پیشاب کر کے اپنے علاقے کی حدود متعیّن کر لیتی ہیں، جو ٹھیک بات ہو سکتی ہے، لیکن ہدایت نامہ یہ نہیں بتاتا کہ اس کا تدارک کیسے کیا جائے۔ میں اس کے قدموں کے نشانات کے پیچھے پیچھے گیا تاکہ اس کی اصلی عادات سے مانوس ہو جاؤں، لیکن میں اس کی خفیہ کمین گاہوں کو دریافت نہیں کر سکا، اس کے گوشہ ہائے عافیت کو، اس کی متلوّن مزاجی کے اسباب کو۔ میں نے اسے سدھانے کی کوشش کی کہ وقت پر کھانا کھائے، ٹیرس پر اپنے گھاس پھوس بھرے ڈبّے کو استعمال کرے، جب سو رہا ہوں تو چھلانگ لگا کر میرے بستر پر نہ آئے اور میز پر رکھے کھانے کو سونگھنے سانگھنے سے باز رہے، اور میں اسے یہ سمجھانے میں ناکام رہا کہ گھر اس کے اختیار سے اس کا اپنا ہے، اس لیے نہیں کہ یہ کوئی جنگی مالِ غنیمت ہے۔ تو میں نے اسے وہ سب جو کرنا چاہتی تھی کرنے دیا۔

جھٹ پٹے کے وقت مجھے بارش کے طوفان کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کی ہری کین جیسی تندو تیز ہوائیں لگتا تھا گھر ہی کو اکھاڑ پھینکیں گی۔ مجھ پر چھینکوں کا دورہ پڑا، میری کھوپڑی دکھنے لگی، اور مجھے بخار چڑھ گیا، اس کے باوجود مجھے لگا ایک ایسی طاقت اور عزم نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا ہے جس کا عمر کے کسی حصے میں یا کسی وجہ سے مجھے تجربہ نہیں ہوا ہے۔ جہاں جہاں سے گھر ٹپک رہا تھا میں نے وہاں وہاں فرش پر برتن جما دیے اور محسوس کیا کہ پچھلی

سردیوں کے بعد سے نئے شگاف پیدا ہوگئے ہیں۔ ان میں سب سے بڑے شگاف نے لائبریری کے دائیں حصے میں پانی بھرنا شروع کردیا تھا۔ میں تیزی سے یونانی اور لاطینی مصنفین کو جو وہاں متمکن تھے بچانے کے لیے لپکا، لیکن جب میں نے کتابیں ہٹائیں تو دیکھا ایک فوّارہ سا بڑے شدید دباؤ کے ساتھ دیوار کے زیریں حصے کے ساتھ ساتھ لگے ٹوٹے ہوئے پائپ سے اُبل رہا ہے۔ میں نے جس طرح بنا اس کا منہ پھٹے پرانے کپڑے ٹھونس کر بند کیا تاکہ کتابوں کو بچانے کی مہلت مل جائے۔ بارش کا کان پھاڑ دینے والا شور اور ہوا کی چنگھاڑ پارک میں شدید ہوگئی۔ پھر ایک واہمے سے کوندے اور اس کے ساتھ بجلی کی کڑک نے فضا کو گندھک کی بڑی تیز بو سے بھر دیا، ہوا نے بالکنی کی کھڑکیوں کے شیشے تباہ کردیے، اور جھکّو تالے توڑ کر گھر کے اندر در آیا۔ اس کے باوجود، دس منٹ سے بھی کم میں اچانک مطلع بالکل صاف ہوگیا۔ ایک شان دار سورج نے کچرے سے اَٹی سڑکوں کو خشک کردیا، اور گرمی لوٹ آئی۔

طوفان کے گزر جانے کے بعد بھی مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ گھر میں تنہا نہیں ہوں۔ اس کی بابت میری واحد توجیہ یہ ہے کہ جیسے حقیقی واقعات فراموش کردیے جاتے ہیں، اسی طرح بعض ایسے بھی جو کبھی ہوئے ہی نہیں ہوتے ہماری یادوں میں بھلادیے جاتے ہیں گویا یہ ہوئے تھے۔ کیونکہ اگر میں نے طوفانِ باد و باراں کی ہنگامی حالت کی یادآوری کی، تو یہ اس لیے کہ میں گھر میں اپنے کو اکیلا نہیں دیکھتا تھا بلکہ ہمیشہ دَیلگدینہ کی رفاقت میں۔ میں نے دورانِ شب اسے اتنا قریب محسوس کیا تھا کہ مجھے اس کے تنفّس کی آواز غسل خانے میں سنائی دیتی اور اس کے رخساروں کی دھڑکن اپنے تکیے پر۔ ہم نے اتنے کم وقت میں اتنا زیادہ کس طرح کیا ہوگا کو سمجھنے کا میرے پاس بس یہی ایک طریقہ تھا۔ میں نے یاد کیا کہ لائبریری کے فُٹ اسٹول پر کھڑا ہوں اور میں نے یاد کیا کہ وہ پھول دار ڈریس پہنے ہوئے مجھ سے کتابیں کسی محفوظ مقام پر رکھنے کے لیے لے رہی ہے۔ میں نے اسے طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے گھر کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا، بارش سے شرابور اور ٹخنوں ٹخنوں پانی میں۔

میں نے یاد کیا کس طرح اگلے دن اس نے ناشتا تیار کیا جو کبھی تھا ہی نہیں اور میز لگائی جب کہ میں فرش خشک کرتا رہا اور تباہ شدہ جہاز جیسے گھر پر نظم و ترتیب مسلّط کرنے کی کوشش۔ میں ہمارے طعام کے دوران اس کی کیفیت کی سنگینی کبھی نہیں بھولا: جب ہماری ملاقات ہوئی تو اس وقت تم اتنے بوڑھے کیوں تھے؟ میں نے جواب میں سچ کہہ دیا: عمر یہ نہیں کے آدمی کتنا بوڑھا ہے بلکہ یہ کہ کتنا بوڑھا محسوس کرتا ہے۔

اس کے بعد سے وہ میری یادوں میں اتنی واضح اور شفاف ہوگئی کہ میں جو چاہتا اس کے ساتھ کرسکتا تھا۔ میں اپنی ذہنی کیفیت کے مطابق اس کی آنکھوں کا رنگ بدل دیتا: آب رنگ جب وہ بیدار ہوتی، راب رنگ جب وہ ہنستی، اور روشنی کے رنگ کی جب وہ خفا ہوتی۔ میں اسے اس عمر اور حالت کے مطابق کپڑے پہناتا جو میری بدلتی مزاجی کیفیتوں سے ہم آہنگ ہوتے: بیس سالہ نا آموز جسے کسی سے محبت ہو، چالیس سالہ بیٹھک کی طوائف، ستر سالہ ملکۂ بابِل، سو سالہ سنت۔ ہم پوچینی کے عشقیہ دوگانے گاتے، آگوستین لارا کے بولیرو، کارلوس گاردیل کے تانگو، اور ہم نے ایک بار پھر یہ تصدیق کردی کہ جو گاتے نہیں، گانے کی مسرت بھی نہیں محسوس کرسکتے۔ آج میں جانتا ہوں کہ یہ فریبِ خیال نہیں تھا بلکہ نوے سال کی عمر میں میری اوّلین محبت کا ایک اور معجزہ۔

جب گھر کی حالت درست ہوگئی تو میں نے روسا کبرکس کو فون کیا۔ یا خدا! میری آواز سنتے ہی وہ مارے حیرت کے پکار اٹھی، میرا تو خیال تھا کہ تم ڈوب ڈاب گئے ہو۔ اس کی سمجھ سے بالا تھا کہ میں نے لڑکی کے ساتھ ایک اور رات بغیر اسے چھوئے گزار دی تھی۔ تمھیں اسے ناپسند کرنے کا پورا حق حاصل ہے، مگر کم از کم ایک بالغ کا چلن تو اختیار کرو۔ میں نے وضاحت کی کوشش کی، مگر اس نے بغیر گریز کیے موضوع ہی بدل ڈالا: خیر، میری نظر میں تمھارے لیے ایک اور ہے جو عمر میں کچھ بڑی ہے، حسین، اور باکرہ بھی۔ اس کا باپ گھر کے عوض لین دین کرنا چاہتا ہے، لیکن اس سے رعایت کی بات کرسکتے ہیں۔ میں سکتے میں آگیا۔ حد ہوگئی، میں نے دہشت کے مارے احتجاج کیا، مجھے تو وہی والی چاہیے، بالکل اسی طرح جیسے وہ ہمیشہ ہوتی

ہے، کسی ناکامی کے بغیر، لڑائی جھگڑوں کے بغیر، بری یادوں کے بغیر۔ لائن پر کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی، اور پھر وہی تابع دارانہ آواز جس میں اس نے کہا، جیسے اپنے سے مخاطب ہو: خیر، ہو نہ ہو یہ وہی ہے جسے ڈاکٹر بڑھاپے کا سٹھیاپا (senile dementia) کہتے ہیں۔

اُس رات دس بجے میں وہاں ایک ڈرائیور کے ساتھ گیا جو اس غیر معمولی خوبی کے واسطے مشہور تھا کہ پوچھ تاچھ نہیں کرتا تھا۔ میں نے ایک سفری پنکھا، اور لاندو رِدیرا کی ایک پینٹنگ پیاری فِلوریتااور اسے دیوار پر ٹانگنے کے لیے ایک ہتھوڑی اور میخ اپنے ساتھ رکھ لیے تھے۔ راستے میں مَیں ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ، خوشبو دار صابن، فلوریڈا واٹر، اور مُلٹھی کے ست کی ٹکیاں خریدنے کے لیے ٹھہر گیا۔ میں کاغذی پھولوں کی بے بضاعتی کو دفع کرنے کے لیے ایک خوش نما پھول دان اور زرد گلابوں کا ایک گل دستہ بھی ساتھ لانا چاہتا تھا، لیکن کوئی جگہ کھلی ہوئی نہ تھی اور مجھے تازہ کِھلے ہوے alstroemerias۔ کا ایک گل دستہ کسی کے ذاتی باغیچے سے چرانا پڑا۔

مالکہ کی ہدایت پر میں اب پیچھے کی گلی سے وہاں آنے لگا تھا، جو آبی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ چلتی تھی، تاکہ کوئی مجھے باغیچے کے دروازے سے داخل ہوتا نہ دیکھ سکے۔ ڈرائیور نے مجھے متنبہ کیا: ہوشیار رہنا، اسکالر، اس گھر میں قتل کر دیتے ہیں۔ میں نے جواب دیا: اگر محبت کی خاطر، تو کوئی مضائقہ نہیں۔ صحن تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، لیکن کھڑکیوں سے روشنی آ رہی تھی، اور چھؤں خواب گاہوں میں موسیقی کا ہنگامہ تھا۔ اپنے کمرے میں مجھے امریکی ٹینور (tenor) دون پیدرو برگس کی دل گداز آواز پورے والیوم کے ساتھ مِگیل ماتاموروس کا بولیرو گاتی سنائی دی۔ مجھے محسوس ہوا کہ مرجاؤں گا۔ میں نے دروازے کو دھکا دے کر کھولا، ہانپتے ہوے، اور دیلگدینہ کو بستر میں اسی طرح پایا جس طرح وہ میری یاد میں تھی: برہنہ اور الوہی سکون میں اپنے قلب والے پہلو کے بَل محوِ خواب۔

لیٹنے سے پہلے میں نے سنگار میز کو درست کیا، زنگ آلود پنکھے کی جگہ نیا پنکھا رکھا، اور تصویر کو اس جگہ آویزاں کر دیا جہاں وہ اسے بستر سے دیکھ سکے۔ میں اس کے برابر لیٹ گیا اور

انچ انچ اس کا معائنہ کیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو میرے گھر کے اندر سے گزری تھی: بالکل وہی ہاتھ تھے جنھوں نے مجھے اندھیرے میں محض لمس سے پہچان لیا تھا، وہی پاؤں جن کی نرم خرامی نے بلّی کے پیروں کا اشتباہ پیدا کیا تھا، میری چادروں پر پسینے کی وہی مہک، وہی انگلی جس نے انگشتانہ پہنا تھا۔ ناقابلِ یقین: اسے جسمانی طور پر دیکھنے اور چھونے میں وہ یاد کے مقابلے میں مجھے کم تر حقیقی لگی۔

سامنے والی دیوار پر تصویر ہے، میں نے اسے بتایا۔ فِگوریتا نے اسے بنایا ہے، ایک آدمی جسے ہم بے حد چاہتے تھے، چکلوں کا بہترین رقاص، اور دل کا اتنا اچھا کہ شیطان کے لیے بھی افسوس محسوس کرتا۔ یہ اس نے جہاز پر استعمال ہونے والے روغن سے سیارا نواڈا ڈی سانتا مارتا میں گرنے والے ہوائی جہاز کے کینوس پر بنائی تھی، ایسے موقلموں سے جو اس نے اپنے کتّے کے بالوں سے وضع کیے تھے۔ جس عورت کی تصویر بنائی ہے وہ ایک نَن [راہبہ] تھی جسے وہ ایک کونوینٹ سے بھگا لایا تھا اور شادی کرلی تھی۔ میں اسے یہیں چھوڑ جاؤں گا تاکہ جاگنے پر یہ تمھیں سب سے پہلی نظر آنے والی چیز ہو۔

جب میں نے، ایک بجے شب، بتّی گل کردی تو وہ ہنوز اپنی سابقہ حالت میں تھی، اور اس کی سانس اتنی آہستگی سے آجارہی تھی کہ میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا زندہ ہے اس کی نبض دیکھی۔ خون کسی نغمے کی روانی کے ساتھ اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا، اس کے جسم کے خفیہ علاقوں میں پھیلتا ہوا اور وہاں سے، محبت سے دھل دھلا کر، اس کے قلب میں لوٹتا ہوا۔

فجر کے وقت وہاں سے لوٹنے سے پہلے میں نے کاغذ کے پرزے پر اس کے ہاتھ کی لکیریں اتاریں اور دیوا صاحبی کو پڑھنے کے لیے دیں تاکہ اس کی روح کا حال جان سکوں۔ اس نے بتایا: ایک شخص جو صرف وہی کہتی ہے جو سوچتی ہے۔ جسمانی مشقت کے لیے بہترین۔ ایک ایسے آدمی سے جو مر چکا ہے اس کا رابطہ ہے اور وہ اس سے مدد ملنے کی متوقع ہے، لیکن وہ غلطی پر ہے: جس مدد کی طالب ہے وہ پہلے سے اس کی پہنچ میں ہے۔ اس کے کوئی تعلقات نہیں رہے ہیں، تاہم وہ بوڑھی ہوکر مرے گی، اور شادی شدہ۔ فی الوقت اس کے مراسم ایک

سائولے آدمی سے ہیں، لیکن یہ وہ نہیں ہوگا جس سے اس کا تعلق زندگی بھر رہے گا۔ اس کے آٹھ بچّے ہو سکتے ہیں لیکن صرف تین ہی ہونے کا فیصلہ کرے گی۔ پینتیس سال کی عمر میں، اگر وہی کرے گی جو اس کا دل کہتا ہے نہ کہ دماغ، تو بہت سی دولت پر تصرّف ہوگا، اور جب چالیس سال کی ہوگی تو ورثہ ملے گا۔ بہت سے سفر کرے گی۔ دہری زندگی اور دہری خوش قسمتی کی مالک ہے اور اپنے مقدر پر اثرانداز ہو سکتی ہے۔ وہ ہر چیز کا تجربہ کرنا چاہتی ہے، تجسّس کے باعث، لیکن اگر اپنے دل کا کہا نہ مانا تو نقصان اٹھائے گی۔

محبت کی اذیت میں مبتلا، میں نے طوفان سے پہنچنے والے ضرر کی درستگی کرائی اور بہت سی دوسری مرمتوں کو بھی نمٹا دیا جو قلاّشی یا کاہلی کے باعث ملتوی کی ہوئی تھیں۔ میں نے جس ترتیب کے ساتھ کتابیں پڑھی تھیں اس کے اعتبار سے لائبریری کی ازسرِنو تنظیم کی۔ خود بخود بجنے والے پیانو کو ایک تاریخی آثار کے طور پر ردّی میں ڈالا، اور اس کے ہمراہ سو کے قریب کلاسیکی موسیقی کے رولز کو بھی، اور ایک استعمال شدہ رکارڈ پلیئر خرید لایا جو میرے موجودہ پلیئر سے بہتر تھا، ساتھ ہی ہائی فیڈیلیٹی والے اسپیکر بھی، جس سے گھر کے رقبے میں توسیع ہوگئی۔ میں بربادی کے کنگرے پر کھڑا تھا لیکن اپنی سی عمر میں ہنوز زندہ ہونا ایک اچھا عوضانہ تھا۔

گھر دوبارہ جی اٹھا اور میں دیلگدینہ سے اپنی محبت میں ایک ایسی شدت، اور شادمانی کے ساتھ بہتا چلا گیا جس کا اپنی سابقہ زندگی میں مجھے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس کا شکر کہ جب میرا نوےواں سال گزر رہا تھا مَیں نے پہلی بار اپنی باطنی ذات کا سامنا کیا۔ مجھے پتا چلا کہ ہر چیز کو اپنی مخصوص جگہ میں دیکھنے کا میرا مالیخولیا، ہر موضوع صحیح وقت پر، ہر لفظ صحیح اسلوب میں، ایک خوب منتظم دماغ کا خوب مستحق اجر نہیں تھا بلکہ اس کا بلکل الٹ: دکھاوے بازی کا ایک پورا نظام جو میں نے اپنی فطرت کے انتشار کو چھپانے کے لیے ایجاد کیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میں کسی خوبی کے باعث منظّم نہیں بلکہ اپنی بے پروائی کے ردِعمل کے طور پر، کہ میں اپنی گراوٹ کو پوشیدہ رکھنے کے لیے فراخ دل نظر آتا ہوں، خود کو سیانا دکھاتا ہوں کیونکہ بدخواہ ہوں، کہ صلح جو ہوں تو اس لیے کہ اپنے دبے ہوے غیظ و غضب کے آگے بپھر انداز نہ ہو جاؤں، کہ اگر

وقت کی پابندی کرتا ہوں تو یہ چھپانے کے لیے کہ میں دوسروں کے وقت کی کتنی کم پروا کرتا ہوں۔ الغرض، میں نے دریافت کیا کہ محبتِ روح کی ایک حالت نہیں بلکہ راس منڈل کی علامت (sign of the zodiac) ہے۔

میں ایک مختلف آدمی بن گیا۔ جن کلاسکس نے اٹھتی جوانی کے دور میں میری راہ نمائی کی تھی، میں نے دوبارہ ان کا مطالعہ کیا، اور انھیں برداشت نہیں کرسکا۔ میں نے ان رومانی نگارشات میں خود کو غرق کردیا جنھیں میں نے اس وقت رد کردیا تھا جب میری ماں نے انھیں بڑی سختی سے مجھ پر مسلّط کیا تھا، اور انھیں میں مجھے یہ آگاہی ملی کہ وہ ناقابلِ تسخیر طاقت جو دنیا کو متحرک رکھتی ہے شادکام محبت نہیں بلکہ وہ محبت ہے جو اتنی ہی گرم جوشی اور والہانہ پن کے ساتھ لوٹائی نہ گئی ہو۔ جب میرا ذوقِ موسیقی بحران کو پہنچا، تو مجھے پر کھلا کہ میں رجعت پسند اور دقیانوسی ہوں، اور میں نے اتفاق کی لذتوں کے لیے اپنا دل کھول دیا۔

میں اپنے سے پوچھتا ہوں آخر کس طرح میں نے اپنے کو اس گھمیری کے تصرّف میں دے دیا تھا جو درحقیقت خود میری ہی لائی ہوئی تھی اور جس سے میں خوف زدہ تھا۔ میں من موجی بادلوں میں اڑتا پھرتا اور آئینے کے سامنے اپنے سے باتیں کرتا اس بے سود امید میں کہ کون ہوں کی تصدیق کرسکوں۔ میری شوریدہ سری کا یہ عالم تھا کہ طلبہ کے ایک مظاہرے کے دوران، جو پتھروں اور بوتلوں سے لیس تھا، مجھے اس کی قیادت سے خود کو باز رکھنے کے لیے بڑی شدید کوشش کرنی پڑی، اس حال میں کہ میں "میں محبت سے دیوانہ ہوں" کی علامتی تختی اٹھائے ہوئے تھا جو میری صداقت کو مطہّر کردیتی۔

محوِ خواب ڈیلگدینہ کی سفاک خیالی احضار سے چکرا کر، میں نے کسی بھی کینہ کپٹ کے بغیر اپنے اتواری کالم کی روح بدل ڈالی۔ موضوع خواہ کچھ بھی ہو، میں انھیں لکھتا اُسی کے لیے تھا، اُسی کی طرف سے ان پر ہنستا یا روتا، اور میری روح ہر لفظ میں کھنچی چلی آتی۔ ایک ذاتی کالم کے جس روایتی انداز کا اتباع یہ پہلے ہمیشہ کیا کرتے تھے، ان کے بجائے اب میں انھیں عشقیہ خطوط کے طور پر لکھتا جنھیں سب لوگ اپنا سکیں۔ اخبار میں مَیں نے یہ تجویز پیش کی کہ

متن کو لائنو ٹائپ کے بجائے خود میری فلورینٹائن طرز کی لکھائی ہی میں چھاپا جائے۔ مدیرِ اعلیٰ نے، ظاہر ہے، یہی سوچا کہ یہ پیرانہ سالی کی خودنمائی کا ایک اور دورہ ہے، لیکن مینیجنگ ایڈیٹر نے اسے ایک فقرے سے رام کرلیا جو ابھی تک وہاں گردش کررہا ہے:

''گرہ میں رکھ لو: پرسکون دیوانے مستقبل سے آگے ہوتے ہیں۔''

عوام کا ردِعمل فوری اور نہایت پُرجوش ثابت ہوا، اور متعدد خطوط ایسے قارئین کی جانب سے آئے جو محبت میں مبتلا تھے۔ بعضے کالم تو خبری نشریات کے دوران تازہ ترین بحرانات کے ساتھ ساتھ ریڈیو پر بھی پڑھے گئے، ان کی ممیوگراف یا کاربن کاپیاں بنائی اور کالیہ سان بلاس کے ٹکڑوں پر اسمگل شدہ سگریٹوں کی طرح بیچی گئیں۔ یہ شروع ہی سے عیاں تھا کہ کالم میری اپنا اظہار کرنے کی آرزو کی تعمیل کررہے تھے، لیکن میں نے دورانِ تحریر اس بات کو خیال میں رکھنے کی عادت ڈال لی، اور ہمیشہ ایک نوّے سالہ کے لہجے میں جو ایک بوڑھے کی طرح غور وفکر کرنا نہیں سیکھ سکا تھا۔ دانش وروں کی جماعت، حسبِ معمول، بودی اور منقسم ثابت ہوئی، اور حد تو یہ ہے کہ وہ ماہرینِ خط شناسی جن کی کبھی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی میرے خط کی بابت اپنے تجزیوں کے عدم توافق سے متعلق تنازعات پر اتر آئے۔ یہ وہی تھے جنھوں نے مختلف اور متضاد آراء کو ہوا دی، مناظراتی بحثوں کو گرما دیا، اور ناسٹلجیا کو مقبولِ عام بنایا۔

سال ختم ہونے سے پہلے میں نے روسا گبرکس سے طے کرلیا تھا کہ وہ برقی پنکھے، بناؤ سنگار کی چیزیں، اور دیگر اشیا جو میں مستقبل میں کمرے کو رہنے کے قابل بنانے کے لیے لاؤں وہیں رہنے دے گی۔ میں دس بجے پہنچتا، ہمیشہ ساتھ کوئی نہ کوئی نئی چیز اس کے واسطے لیے، یا ہم دونوں کے واسطے، اور چند منٹ اپنے شبانہ تھیٹر کو جمانے کا پوشیدہ اضافی سامان نکالنے میں لگاتا۔ واپسی سے قبل، جو پانچ بجے سے پہلے کبھی نہیں ہوتی، میں اس سامان کو تالا چابی لگا کر محفوظ کردیتا۔ تب غسل خانہ اتفاقی گاہکوں کی غم زدہ محبتوں کے لیے اپنی پرانی غلیظ حالت پر لوٹ آتا۔ ایک صبح میں نے سنا کہ مارکوس پیریس، دن نکلنے کے بعد ریڈیو پر سب سے زیادہ سنی جانے والی آواز، نے میرے اتواری کالم اپنے پیر کی خبری نشریات میں پڑھنے کا فیصلہ کیا ہے۔

جب میں اپنی متلی پر قابو پانے کے قابل ہوگیا تو میں نے کراہت سے کہا: تو اب جان گئیں، دَیلگد ینہ، کہ شہرت ایک بے حد فربہ اندام عورت ہے جو آدمی کے ساتھ ہم بستری نہیں کرتی، لیکن جب وہ بیدار ہوتا ہے، تو ہمیشہ اس کی پائنتی سے لگی اسے دیکھ رہی ہوتی ہے۔

انھیں دنوں میں ایک بار روسا کَبرکَس کے ساتھ ناشتا کرنے ٹھہر گیا، جو اپنے کڑے سوگ اور سیاہ بونیٹ کے باوجود جس نے اس کی بھوؤں کو چھپا رکھا تھا، اب قدرے کم نحیف و نزار نظر آنے لگی تھی۔ اس کے ناشتے شاندار مشہور تھے، اور مرچیں اتنی وافر کہ میری آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ پہلا آتشیں لقمہ ہی توڑا تھا کہ آنسوؤں سے تربتر ہوگیا، اور بولا: آج رات میری مقعد کو جلنے کے لیے پورے چاند کی حاجت نہیں ہوگی۔ شکایت مت کرو، اس نے کہا۔ اگر یہ جلتی ہے تو اس لیے کہ ابھی تک تم ایک کے مالک ہو، خدا کا شکر۔

جب میں نے دَیلگد ینہ نام کا ذکر کیا تو وہ حیران رہ گئی۔ یہ اس کا نام نہیں، وہ بولی، اس کا نام تو ــ ــ ــ بتاؤ نہیں، میں نے مداخلت کی، میرے لیے وہ دَیلگد ینہ ہی ہے۔ اس نے کندھے جھٹکائے: خیر یوں ہی سہی، ظاہر ہے وہ تمھاری جو ہوئی۔ لیکن مجھے تو یہ کسی پیشاب آور دوا کا سا نام معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اسے باگھ سے متعلق فقرے کی بابت بتایا جو لڑکی نے آئینے کے اوپر لکھ دیا تھا۔ یہ وہ نہیں ہوسکتی، روسا بولی، اسے لکھنا پڑھنا آتا ہی نہیں۔ تو پھر کون تھا؟ اس نے شانے اچکائے: کسی ایسے کی جانب سے جس کی اس کمرے میں موت واقع ہوئی ہو۔

میں نے ان ناشتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روسا کَبرکَس کے سامنے اپنے دل کا بوجھ اتارنا شروع کردیا، اور میں نے اس سے دَیلگد ینہ کی خیرخواہی اور خوش نمائی کے واسطے چھوٹی موٹی نوازشوں کی درخواست کی۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے یہ عطا کردیں، اور کسی اسکول کی طالبہ کے شرارتی پن کے ساتھ۔ کیسی مزے دار بات ہے! اس نے اس وقت کہا۔ مجھے یوں لگا جیسے اسے اپنی بیوی بنانے کے لیے مجھ سے مانگ رہے ہو۔ اور اسی حوالے سے، اس نے سرسری انداز میں کہا، تم اس سے شادی کیوں نہیں کرلیتے؟ میں مبہوت رہ گیا۔ میں بالکل سنجیدہ

ہوں، اس نے اصرار کیا، یہ ستا رہے گا۔ ظاہر ہے، تمھاری سی عمر میں مسئلہ یہ ہے کہ تم کام کے رہے ہو یا نہیں، لیکن تم کہہ چکے ہو کہ یہ مسئلہ حل کر لیا ہے۔ میں نے اس کی بات کاٹ دی: جب محبت نہ مل سکے تو جفتی ہی تسکین کے لیے رہ جاتی ہے۔

اس نے قہقہہ لگایا۔ آہ، میرے اسکالر، مجھے ہمیشہ سے معلوم تھا کہ تم سچ مچ کے مرد ہو، ہمیشہ سے رہے ہو اور مجھے خوشی ہے کہ اب بھی ہو جب کہ تمھارے دشمن اپنے ہتھیار ڈال رہے ہیں۔ کوئی وجہ ہے جبھی لوگ تمھارا اتنا زیادہ ذکر کرتے ہیں۔ تم نے مارکوس پیریس کو سنا؟ ہر کوئی اسے سنتا ہے، میں نے کہا، موضوع کو بدلنے کے لیے۔ لیکن اس نے اصرار کیا: پروفیسر کماچو یا کانو نے بھی *The Little Bit of Everything Hour* میں کل کہا تھا کہ دنیا جیسی پہلے تھی اب نہیں رہی کیونکہ اب اس میں تم جیسے مرد نہیں رہے۔

اس ویک اینڈ مجھے معلوم ہوا کہ دیلگد ینہ کو کھانسی بخار ہو گیا ہے۔ میں نے روسا کبرکس کو کسی گھریلو علاج کے لیے جگایا، اور وہ اپنا فرسٹ ایڈ کا ڈبہ کمرے میں اٹھا لائی۔ دو دن بعد بھی دیلگد ینہ چت پڑی تھی اور بٹن ٹانکنے کے معمول پر واپس نہیں جا سکی تھی۔ معمولی سے وبائی زکام کے مداوے کے لیے ڈاکٹر نے کسی گھریلو دوا کا نسخہ دے دیا تھا جس سے بیماری ہفتہ بھر میں جاتی رہے گی، لیکن ناکافی غذا ملنے سے اس کی جو حالت ہو گئی تھی اس پر پریشانی کا اظہار بھی کیا۔ میں نے اس سے ملنا بند کر دیا، اس کی کمی کو شدت سے محسوس کیا، اور اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر کمرے کو اس کی موجودگی کے بغیر آراستہ کر لیا۔

میں سیسیلیا پورّس کی آلورو سپیدا کے افسانوں کی کتاب "ہم سب انتظار کر رہے تھے" کے لیے بنائی ہوئی ایک پین اینڈ اِنک ڈرائنگ بھی لے آیا۔ اور اپنی بے خواب راتیں کاٹنے کے لیے روماں رولاں کی "ژاں کریستوف" کی چھؤں جلدیں بھی۔ اور یوں، جب دیلگد ینہ کمرے واپس آنے کے قابل ہو گئی، تو اسے ایک عافیت گزیں مسرت کے شایانِ شان پایا: ہوا جسے مہک دار کیڑے مار دوا کے استعمال سے پاک و صاف کیا گیا تھا، گلابی رنگ کی دیواریں، شیڈ والے لیمپ، گلدانوں میں تازہ پھول، میری پسندیدہ کتابیں، میری ماں کی اچھی

سی پینٹینگز جنھیں مختلف انداز میں آویزاں کیا گیا تھا، جدید ذوق کے مطابق۔ میں نے پرانے ریڈیو کو ایک شارٹ ویو ریڈیو سے بدل لیا تھا جسے کلاسیکی موسیقی کے پروگرام نشر کرنے والے اسٹیشن سے لگا دیا تھا تا کہ ڈیلگد ینہ موتزارٹ کے کورٹیٹس کو سنتے ہوئے نیند سے ہم آغوش ہو، لیکن ایک رات دیکھا کہ وہ ایک ایسے اسٹیشن سے لگا ہوا ہے جو خاص طور پر مقبولِ عام بولیروز نشر کرتا تھا۔ یہ اس کی پسند تھی، بے شک، اور میں نے اسے کسی دل گرفتگی کے بغیر قبول کرلیا، کیونکہ اپنے بہتر دنوں میں مَیں نے بھی اسی پسند کی پرورش کی تھی۔ اگلے روز گھر لوٹنے سے پہلے، میں نے لپسٹک سے آئینے پر لکھا: پیاری لڑکی، ہم دنیا میں تنہا ہیں۔

اسی زمانے میں مجھے یہ عجیب احساس ہوا کے وہ اپنے وقت سے پہلے بڑی ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے اس کا روسا کبرَکس سے ذکر کیا، جس کا خیال تھا کہ یہ فطری تھا۔ پانچ دسمبر کو وہ پندرہ سال کی ہو رہی ہے، وہ بولی۔ ایک کامل قنطوری۔ اس بات سے مجھے بے چینی ہوئی کہ وہ اتنی حقیقی ہے کہ اس کی سالگرہ منائی جائے۔ میں اس کیا دے سکتا ہوں؟ بائیسکل، روسا کبرَکس نے کہا۔ اسے بٹن ٹانکنے جانے کے لیے دن میں دو بار شہر پار کرنا پڑتا ہے۔ عقبی کمرے میں اس نے مجھے وہ بائیسکل دکھائی جو ڈیلگدینہ استعمال کرتی تھی، اور سچ تو یہ ہے وہ مجھے کاٹھ کباڑ لگی جو ایک اتنی چاہی جانے والی عورت کے شایان نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس نے مجھے ڈیلگدینہ کے حقیقی زندگی میں وجود کے ایک ٹھوس ثبوت کے طور پر مت اُثر کیا۔

جب میں اس کے واسطے بہترین سائیکل خریدنے گیا تو اسے چلا کر دیکھنے کی ترغیب کو دبا نہ سکا، اور یونہی سرسری طور پر دکان کی اندرونی ڈھلواں سطح کے چند چکر لگائے۔ جب سیلز مین نے میری عمر پوچھی تو میں نے عمر کے چونچال سے جواب دیا: تقریباً اکیانوے۔ اس نے وہی کہا جو ٹھیک میں اس سے سننا چاہتا تھا: بھئی حد ہوگئی، تم اس سے بیس سال چھوٹے نظر آتے ہو۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ میں نے طفلِ مکتب کی سی وہ مہارت کیسے قائم رکھی تھی، اور میں نے اپنے کو ایک درخشاں مسرت سے اُبلتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نغمہ سنج ہوگیا۔ پہلے اپنے لیے، مدھم آواز میں، پھر پوری آواز کے ساتھ، عظیم کاروسو کے سروں میں، عوامی بازار کی بھڑک دار

دکانوں اور بادلے ٹریفک کے بیچوں بیچ۔ لوگ مجھے دیکھ کر تفریح لینے لگے، آوازیں دے کر پکارنے لگے، بیولتا اَ کولوبیا کی بائیسکل ریس میں معذوروں کی گاڑی (وہیل چیئر) میں بیٹھ کر شرکت کرنے کا تقاضا کرنے لگے۔ میں نے کسی مسرور جہازران کی سلامی سے ان کا جواب دیا، اور اپنی نغمہ ریزی میں رکاوٹ نہیں آنے دی۔ اُس ہفتے، دسمبر کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی خاطر، میں نے ایک اور بے دھڑک کالم لکھ مارا: ''نوّے سال کی عمر میں بائیسکل کی سواری سے کس طرح خوش ہوا جاسکتا ہے۔''

سالگرہ والی رات میں نے دَیلگدینہ کو پورا گانا گا کر سنایا، اور اس کے پورے جسم پر اتنے بوسے دیے کہ بے دم ہوگیا: اس کی ریڑھ، ریڑھ کا ہر ہر جوڑ، تا آنکہ اس کے نڈھال نڈھال کولہے، تِل والا پہلو، اَن تھک دل والا پہلو۔ میرے بوسوں کے ساتھ ساتھ اس کے بدن کی تپش بڑھ گئی، اور وہ ایک وحشی، بے قابو سی مہک کی لو دینے لگی۔ میرے بوسوں کے جواب میں نئے نئے ارتعاشات اس کی جلد کے چپّے چپّے پر رونما ہوئے، اور ان میں سے ہر ارتعاش پر مجھے ایک نمایاں حدت، ایک منفرد ذائقہ، ایک مختلف کراہ محسوس ہوئی، اور اس کا سارا جسم اندر ہی اندر آرپے جیو کی طرح تھرتھرایا اور اس کی چوچیاں بغیر چھوئے ہوئے کھل کر پھول بن گئیں۔ رات کے پچھلے پہر مجھے نیند آنے لگی تھی کہ مجھے سمندر میں کسی انبوہ کی آواز اور درختوں میں خوف وہراس کی کیفیت سنائی دی جس نے میرے دل کو چھید کر رکھ دیا۔ میں غسل خانے میں گیا اور آئینے کے اوپر لکھ دیا: دَیلگدینہ، میری جان، کرسمس کے جھکّڑ آگئے ہیں۔

میری مسرورترین یاد ایک کھلبلی کی یاد ہے جو میں نے ایسی ہی ایک صبح اسکول چھوڑتے وقت محسوس کی تھی۔ مجھے کیا ہوگیا ہے؟ حواس باختہ استاد نے کہا: آہ، میرے لڑکے، نہیں دیکھتے کہ یہ جھکّڑ ہیں؟ آٹھ سال بعد یہ مجھے اس وقت پھر محسوس ہوئی جب میں دَیلگدینہ کے بستر میں بیدار ہوا، اور یہ وہی وقت کا پابند دسمبر تھا جو اپنے نیم شفّاف آسمانوں کے ساتھ لوٹ رہا تھا،

اپنے ریتیلی آندھیوں، سڑکوں پر اپنے بگولوں کے ساتھ جو گھروں کی چھتیں اُڑا دیتے اور اسکول کی لڑکیوں کے اسکرٹ اوپر کو اُٹھا دیتے۔ اس وقت شہر ایک آسیبی گونج اختیار کرلیتا۔ ہوادار راتوں میں، پہاڑیوں میں واقع محلّوں تک میں، عوامی بازاروں کی چیخ و پکار اتنے قریب سے آتی سنائی دیتی جیسے یہ پاس کے نکّڑ سے آرہی ہو۔ یہ غیر معمولی بات نہیں تھی کہ دسمبر کے جھکّڑوں میں دوستوں کی آوزوں سے ان کے محلِ وقوع کا پتا بتا دیتے جو دور دور کے قحبہ خانوں میں بکھرے ہوئے ہوتے۔

تاہم جھکڑ میرے لیے یہ بری خبر بھی لائے کہ دیلگد ینہ کرسمس کی چھٹیاں میرے ساتھ نہیں بلکہ اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارے گی۔ اگر مجھے دنیا میں کسی چیز سے نفرت ہے تو یہ زبردستی کے تہوار منانا ہے جس میں لوگ ٹسوے بہاتے ہیں کیونکہ خوش ہوتے ہیں، اس کی نقلی روشنیاں، کھوکھلی مناجات (carols)، چٹنٹ دار کاغذ کے پھولوں کے حلقے جن کا اس بچّے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا جو دو ہزار سال پہلے ایک افلاس زدہ اصطبل میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے باوجود، جب رات آئی تو میں اپنے ناسٹلجیا سے مجبور ہوکر اس کے بغیر کمرے گیا۔ مجھے اچھی نیند آئی اور ایک روئیں دار ریشمیں سفید ریچھ کے برابر جو ایک سفید ریچھ ہی کی طرح اپنی پچھلی ٹانگوں پر چلتا تھا میری آنکھ کھلی۔ ساتھ ہی ایک کارڈ رکھا ہوا تھا جس پر درج تھا: بدصورت پپا کے لیے۔

روسا کبرکس مجھے بتا چکی تھی کہ دیلگد ینہ ان سبقوں سے جو میں آئینے پر لکھ جاتا تھا پڑھنا سیکھ رہی ہے، اور مجھے اس کی تحریر کی خوبی مستحسن لگی۔ لیکن مالکہ نے یہ ناخوش گوار خبر سنا کر کہ ریچھ خود اس نے تحفتاً دیا ہے میرے سارے طلسمِ خیال پر پانی پھیر دیا، اور اسی لیے سالِ نو کی آمد سے پچھلے دن میں گھر ہی پر پڑا رہا اور آٹھ بجے ہی بستر میں جا گھسا، اور بغیر کوئی تلخی محسوس کیے سو گیا۔ میں خوش تھا، کیونکہ بارہ کا گھنٹہ بجتے ہی، گھنٹیوں کی آپے سے باہر گونجتی لہروں، فیکٹری اور آگ بجھانے والے انجن کے سائرنوں، جہازوں کی فریادی غوں غاں، آتش

بازیوں اور خدنگوں کے دھماکوں کے درمیان، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ڈیلگڈ ینہ پنجوں کے بَلداخل ہوئی ہے، میرے برابر لیٹ گئی ہے، اور مجھے بوسہ دیا ہے۔ اتنی حقیقی کہ اس کی ملٹھی جیسی مہک میرے منھ میں باقی رہ گئی ہے۔

—۴—

سالِ نو کے شروع میں ہم ایک دوسرے کو اتنی اچھی طرح جاننے لگے تھے گویا اپنی بیداری کے وقت میں بھی ساتھ ساتھ رہ رہے ہوں، کیونکہ میں نے آواز کا ایک ایسا محتاط لہجہ دریافت کرلیا تھا جسے وہ بغیر جاگے ہوئے سنتی، اور اس کا جواب مجھے اپنے بدن کی فطری زبان میں دیتی۔ اس کی ذہنی کیفیات کا اندازہ اس کے سونے کی روش سے کیا جاسکتا تھا۔ اوّل اوّل واماندہ اور کندۂ ناتراش، وہ رفتہ رفتہ ایک ایسے باطنی سکون سے قریب ہورہی تھی جو اس کے چہرے کو حسن اور اس کی نیند کو ثروت بخش رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی زندگی کے بارے میں بتایا، میں نے سرگوشیوں میں اپنے اتواری کالموں کے پہلے ڈرافٹ پڑھ کر سنائے جن میں، میرے کہے بغیر، وہ اور صرف وہی موجود تھی۔

انھیں دنوں مَیں اس کے تکیے پر ایک زمرّدی بندوں کی جوڑی چھوڑ آیا جو میری ماں کی ملکیت تھے۔ یہ اس نے جائے مقررہ پر ہماری اگلی ملاقات پر پہنے لیکن یہ اس پر جچے نہیں۔ پھر میں ایک اور جوڑی لایا جو اس کے جسم کے رنگ سے بہتر مطابقت رکھتی تھی۔ میں نے وضاحت کی: پہلے والے تم جیسی عورت اور تمھارے جیسے بالوں کے انداز کے لیے مناسب نہیں تھے۔ یہ

اچھے لگیں گے۔ اگلی دو ملاقاتوں میں اس نے کوئی بندے سرے سے پہنے ہی نہیں، لیکن تیسری پر اس نے جو میں نے تجویز کیے تھے پہنے۔ اس طرح میں نے دریافت کیا کہ وہ میرے احکام کی اطاعت نہیں کرتی بلکہ مجھے فرحت پہنچانے کے موقعے کا انتظار۔ اب میں اس قسم کی گھریلو زندگی کا اتنا عادی ہوگیا تھا کہ مزید برہنہ سونا چھوڑ دیا بلکہ چینی ریشم کا شب خوابی کا لباس پہننا شروع کردیا جس کا استعمال میں نے اس لیے ترک کردیا تھا کہ وہاں تھا ہی کون جس کی خاطر اسے اتار سکتا۔

میں اسے سینٹ اَیگزوپیری کی "ننھا شہزادہ" پڑھ کر سناتا، اس فرانسیسی مصنف کی کتاب جس کی ساری دنیا، سوائے فرانسیسیوں کے، گرویدہ ہے۔ یہ اسے بغیر جگائے اس کا دل بہلانے کے لیے پہلی کتاب تھی، اور حقیقت یہ ہے کہ اسے پوری پڑھ کر سنانے کے لیے مجھے مسلسل دو دن وہاں جانا پڑا۔ ہم نے یہ سلسلہ پیرو کی "ٹیلن" "سیکریڈ ہسٹری،" اور "اریبین نائٹس" کے بچوں کے لیے پاک کردہ ورژن میں جاری رکھا، اور ان کے فرق کے باعث مجھے احساس ہوا کہ اس کی نیند کی گہرائی کی بھی مختلف سطحیں ہیں جن کا انحصار قرأت سے اس کی دل چسپی پر ہے۔ جب مجھے لگتا کہ وہ سب سے گہری سطح کو چھونے لگی ہے تو میں بتی بجھا دیتا اور اس کے گرد اپنی باہیں ڈال کر اس وقت تک سوتا رہتا جب تک کہ مرغ اذانیں نہ دینے لگتے۔

میں اتنا خوش تھا کہ بے حد سہج سہج سے اس کے پپوٹوں کے بوسے لیتا، اور ایک رات جیسے آسمان میں بجلی کوند گئی: وہ پہلی بار مسکرائی۔ بعد میں، بغیر کسی بھی وجہ کے، وہ بستر پر لوٹی، میری طرف اپنی پشت پھیر لی، اور آزردگی سے بولی: یہ ایسابیل تھی جس نے گھونگھوں کو رُلایا تھا۔ مکالمے کی امید سے جوش میں آکر، میں نے اسی لہجے میں دریافت کیا: کن کے تھے؟ اس نے جواب نہیں دیا۔ اس کی آواز میں ایک عامی کی چھاپ تھی، جیسے یہ اس کی نہ ہو بلکہ اس کے اندر بیٹھے ہوئے کسی دوسرے کی ہو۔ بس یہ وہی موقع تھا جب شک و شبہے کی آخری پرچھائیں میری روح سے اٹھ گئی: اس کی نیند میرے لیے زیادہ پسندیدہ تھی۔

میری ساری مصیبت بلّی تھی۔ کچھ کھا کر نہ دیتی، بے حد الگ تھلگ رہتی، دو دن اپنے مخصوص کونے میں بغیر سر اٹھائے پڑی رہی، اور جب میں نے اسے بید کی ٹوکری میں ڈالنے کی کوشش کی کہ دَمیانہ اسے کسی جانوروں کے ڈاکٹر کو دکھالائے تو کسی زخمی جانور کی طرح مجھے پنجے مارنے لگی۔ اسے قابو میں لانے کے لیے وہ بس یہی کرسکتی تھی، اور وہ اسے وہاں لے گئی، احتجاج کرتے ہوے، ایک بورے میں ڈال کر۔ تھوڑی ہی دیر میں جانوروں کی پناہ گاہ سے یہ کہنے کے لیے اس کا فون آیا کہ اسے مار ڈالنے کی صلاح ہے اور میری اجازت درکار ہے۔ کیوں؟ کیونکہ بہت بوڑھی ہے، دَمیانہ نے کہا۔ میں نے طیش میں آ کر سوچا کہ انھیں چاہیے کہ مجھے بھی بلّیوں سے بھری بھٹی میں ڈال کر زندہ بھون ڈالیں۔ مجھے لگا جیسے دو آتشوں کے درمیان آ پھنسا ہوں: میں بلّی سے پیار کرنا نہیں سیکھ سکا تھا، لیکن اسے مروا دینے کا حکم دینے کی ہمت بھی نہیں تھی، صرف اس لیے کہ بوڑھی ہوگئی ہے۔ ہدیات نامے میں یہ کہاں لکھا تھا؟

اس واقعے نے مجھے اتنا پریشان کردیا کہ میں نے اتواری کالم ایسے عنوان کے تحت لکھا جو نرودا سے غصب کیا تھا: ''کیا بلّی بیٹھک کی ننھّی شیرنی ہے؟'' کالم نے ایک نئی مہم چلا دی جس نے ایک بار پھر قارئین کو دو گروہوں میں تقسیم کردیا، وہ جو بلیوں کے حق میں تھے اور وہ جو بلّیوں کے خلاف تھے۔ پانچ دن بعد غالب آنے والا نظریہ یہ تھا کہ بلّی کی جان لینا صحتِ عامہ کے خیال سے تو جائز ہوسکتا ہے لیکن اس لیے نہیں کہ بوڑھی ہوگئی ہے۔

میری ماں کے انتقال کے بعد، میں اپنے اس ڈر کی وجہ سے کہ سوتے میں کوئی مجھے چھو لے گا مسلسل جاگتا رہتا۔ ایک رات میں نے اس کا لمس محسوس کیا، لیکن اس کی آواز نے میری طمانیت بحال کردی: میرے ننّھے سے غریب بیٹے ۔ ایسا ہی تجربہ مجھے ایک رات دَیلگد ینہ کے کمرے میں بھی ہوا، اور میں لطف و آسائش سے بَل کھانے لگا، اس یقین کے ساتھ کہ اس نے مجھے چھوا ہے۔ لیکن نہیں: اندھیرے میں یہ روسا کبَرکَس تھی۔ کپڑے پہن کر میرے ساتھ آؤ، وہ بولی، مجھے بڑا سخت مسئلہ درپیش ہے۔

اور اسے درپیش تھا، اور میرے تصوّر سے بھی زیادہ سخت۔ قحبہ خانے کا بہت اہم گاہک

پویلین کے پہلے کمرے میں چاقو کے وار سے قتل کر دیا گیا تھا۔ قاتل فرار ہوگیا تھا۔ خون سے لت پت بستر میں لحیم شحیم مردے پر، برہنہ لیکن جوتے پہنے ہوئے، کسی اُبلے ہوئے مرغ کی سی پیلاہٹ طاری تھی۔ داخل ہوتے ہی میں اسے پہچان گیا: یہ ج۔م۔ب۔ تھا، ایک بڑا بھاری بینکر، جو اپنے شائستہ رکھ رکھاؤ، اچھی فطرت، نفیس لباس، اور سب سے زیادہ اپنی رہائش گاہ کی خوش وضعی کے لیے مشہور تھا۔ اس کی گردن پر ہونٹ کی شکل کے دو ارغوانی زخم تھے، اور شکم پر کے گہرے گھاؤ سے خون ہنوز رِس رہا تھا۔ موت سے اس کے اعضا ابھی اکڑے نہیں تھے۔ اس کے زخموں سے زیادہ جس بات نے مجھے متوجہ کیا وہ یہ تھی کہ موت کے باعث اس کے سکڑے ہوئے عضو پر ایک کونڈم، بظاہر غیر استعمال شدہ، ہنوز چڑھا ہوا تھا۔

روسا گبرَکس کو نہیں معلوم تھا کہ وہ یہاں کس کے ساتھ تھا کیونکہ اس کو بھی یہاں باغ والے دروازے سے آنے کا امتیاز حاصل تھا۔ اس شبہے کو کہ اس کا ساتھی ایک آدمی رہا ہو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مالکہ مجھ سے صرف اتنا چاہتی تھی کہ لاش کو کپڑے پہنانے میں مدد دوں۔ وہ اتنی پُراستقامت تھی کہ اس خیال نے مجھے پراگندہ کر دیا کہ اس کے واسطے موت محض باورچی خانے کا کوئی معاملہ ہو۔ مردہ آدمی کو کپڑے پہنانے سے زیادہ مشکل کوئی اور کام نہیں، میں نے کہا۔ مَیں یہ ایک سے زائد بار کر چکی ہوں، اس نے جواب دیا۔ اگر کوئی اسے پکڑے رہے تو آسان ہے۔ میں نے توجہ دلائی: تمھارے خیال میں کون اس پر یقین کرے گا کہ چاقو کے زخموں سے چھلنی جسم ایک انگلش جنٹلمین کے صحیح سالم کپڑوں کے اندر چھپا ہوا ہے؟

میں دَیلگد ینہ کا خیال کر کے کانپ گیا۔ بہتر ہوگا کہ تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ، روسا گبرَکس نے کہا۔ اس سے بہتر تو مر جانا ہے، میں نے کہا، میرا لعابِ دہن برف کی طرح خشک۔ یہ اسے نظر آ گیا اور وہ اپنی کراہت چھپا نہ سکی: تم کپکپا رہے ہو! اُس کی خاطر، میں نے کہا، گو یہ نصف سچ ہی تھا۔ اس سے کہو کہ کسی کے آنے سے پہلے ہی رفو چکّر ہو جائے۔ ٹھیک ہے، وہ بولی، لیکن ایک رپورٹر کی حیثیت سے تمھیں کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ اور نہ تمھیں، میں نے کہا، ایک مخصوص تلخی کے ساتھ۔ موجودہ حکومت میں تنہا تمھیں ایک لبرل ہو جسے اختیار حاصل

ہے۔

شہر، جس کی پرسکون فطرت اور طبعی سلامتی کی بے حد مانگ تھی، ہر سال کسی نہ کسی رسوا کُن، بہیمانہ قتل کی نحوست کے باعث پستی میں گرتا جارہا تھا۔ لیکن یہ ویسا قتل نہیں تھا۔ دفتری اخباری رپورٹ کے مطابق، جس کی سرخیاں شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھیں اور تفصیلات بہ قدرِ اشکِ بلبل، نوجوان بینکر کو پرادومار ہائی وے پر نامعلوم وجوہ کی بنا پر چاقو مار مار کے ہلاک کردیا گیا تھا۔ اس کے کوئی دشمن نہیں تھے۔ سرکاری اطلاع نامے میں بتایا گیا تھا کہ گمان تھا کہ قاتلین اندرونِ ملک سے آنے والے پناہ گیر تھے جنھوں نے شہر میں جرائم کی ایسی لہر چھوڑدی تھی جو اس کے اہالیوں کی شہری روح کے لیے بے گانہ تھی۔ شروع کے چند گھنٹوں میں پچاس سے زیادہ حراستیں عمل میں آئیں۔

جذبات برانگیختہ، میں قانونی رپورٹر کی طرف متوجہ ہوا، دوسری دہائی کا ایک مثالی اخباری جو سبز چشمہ لگاتا تھا اور اپنی آستینوں پر الاسٹک کی پٹیاں پہنتا تھا اور حقائق کی پیش بینی کرنے پر فخر کرتا تھا۔ اسے، بس، جرم کے اِکّا دُکّا تانے بانے معلوم تھے، اور میں نے عاقبت اندیشی کا جو تقاضا ہوسکتا تھا اس کے مطابق اسے معلومات بہم پہنچائیں۔ چنانہ اپنے چار ہاتھوں سے ہم نے صفحۂ اوّل کے لیے آٹھ کالم کے مضمون کے واسطے پانچ صفحے کالے کیے، جسے ہم نے معتبر ذرائع کے ازلی پیکرِ خیالی کو منصوب کیا جس پر ہمیں اعتمادِ کامل تھا۔ لیکن نحوستی مردِ معدوم سینسر اس پر سرکاری بیان مسلّط کرنے سے باز نہیں آیا جس کے مطابق یہ لبرل قانون شکنوں کا کیا ہوا حملہ تھا۔ میں نے صدی کی سب سے زیادہ بھری پُری تقریبِ تجہیز و تکفین میں خشم گیں ماتم کے ساتھ اپنا ضمیر پاک صاف کرلیا۔

اس رات گھر لوٹنے کے بعد میں نے روسا کبَرکس کو ڈیلگدینہ پر کیا گزری پوچھنے کے لیے فون کیا، لیکن اس نے چار دن تک فون کا جواب نہیں دیا۔ پانچویں دن میں دانت بھینچے اس کے گھر پہنچا۔ دروازے سرکاری طور پر بند کردیے گئے تھے، پولیس کی طرف سے نہیں بلکہ شعبۂ صحت کی طرف سے۔ آس پڑوس میں کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔ ڈیلگدینہ کا کوئی اتا پتا نہ پاکر میں

نے اس کی دیوانہ وار اور بعض اوقات مضحکہ خیز تلاش شروع کی جس کے باعث ہانپنے لگا۔ ایک گردآلود پارک کی بینچوں پر بیٹھے بیٹھے، جہاں کھیل میں مصروف بچّے سیمون بولیوار کے جھڑتے ہوئے مجسمے کے بالکل اوپر تک چڑھ جاتے، میں دنوں نوجوان سائیکل چلانے والیوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ ہرنیوں کی طرح پاس سے گزر جاتیں: حسین، سہل الحصول، آنکھ مچولی کے کھیل میں پکڑی جانے کو تیار۔ جب مجھے اور امید نہیں رہی تو میں نے بولیروز سے ملنے والے سکون میں پناہ لی۔ لیکن یہ ایک جان لیوا مداوا ثابت ہوا: ہر بول ڈیلگد ینہ تھا۔ لکھنے کے لیے مجھے ہمیشہ خاموشی درکار رہی تھی کیونکہ میری توجہ لکھنے سے زیادہ موسیقی کی طرف لگی رہتی۔ لیکن اب اس کا بالکل الٹ ہورہا تھا: میں صرف بولیروز کی چھاؤں میں لکھ سکتا تھا۔ میری زندگی اُس سے لبریز ہوگئی۔ ان دو ہفتوں میں جو کالم میں نے لکھے عشقیہ خطوط کی رمز بندی کے نمونے تھے۔ ملنے والے خطوط کے برفشار سے جز بز ہوکر مینیجنگ ایڈیٹر نے مجھ سے محبت کو اعتدال میں رکھنے کے لیے کہا تاکہ اس درمیان میں ہم فرقت زدہ قارئین کی تسکین کا کوئی ذریعہ تلاش کرسکیں۔

سکون کی کمی نے میرے شب و روز کی درستگی کو ختم کردیا۔ میں پانچ بجے جگ جاتا لیکن کمرے کی تاریکی میں پڑے پڑے ڈیلگد ینہ کا اس کی غیر حقیقی زندگی میں تصوّر کرتا رہتا، کس طرح وہ اپنے بھائی بہنوں کو نیند سے جگا رہی ہے، اسکول کے لیے انھیں کپڑے پہنا رہی ہے، کھانے کو کچھ ہوا تو انھیں ناشتا دے رہی ہے، اور بائیسکل پر شہر پار کررہی ہے تاکہ بٹن ٹانکنے کی سزا پوری کرے۔ میں نے حیرت کے ساتھ خود سے پوچھا: بٹن ٹانکتے وقت بھلا ایک عورت کیا سوچتی ہے؟ کیا وہ میرے بارے میں سوچتی ہے؟ کیا وہ بھی روسا کبرکس کو تلاش کررہی تھی تاکہ میرے بارے میں معلوم کرسکے؟ پورے ایک ہفتے میں نے دن و رات اپنا مستری والا بالاپوش تن سے جدا نہیں کیا، نہ نہایا، نہ ڈاڑھی مونڈی، نہ دانت صاف کیے، کیونکہ محبت نے بہت دیر سے مجھے سکھایا تھا کہ آدمی کسی کے لیے بنتا ٹھنتا ہے، کسی کے لیے کپڑے پہنتا ہے اور خوشبو لگاتا ہے، اور میرا کبھی کوئی تھا ہی نہیں کہ جس کے لیے یہ سب تکلفات کرتا۔ دَمیانہ نے جب دس بجے صبح مجھے ہیمک میں برہنہ دیکھا تو سمجھی کہ بیمار ہوں۔ میں نے خواہش سے دھندلائی ہوئی

آنکھوں سے اسے دیکھا اور کپڑے اتار کر مجامعت کی دعوت دی۔ اس نے، کسی قدر استہزا سے، کہا:

''تم نے سوچا ہے کہ اگر میں نے ہاں کر دی تو کیا کرو گے؟''

اس طرح مجھے معلوم ہوا کہ میرے اَلم نے مجھے کس درجہ گرا دیا ہے۔ اپنے نوجوان کے سے دکھ میں مَیں خود کو پہچان نہیں سکا۔ میں باہر نہیں نکلا، مبادا فون آئے اور کوئی اٹھانے والا نہ ہو۔ میں اسے منقطع کیے بغیر ہی لکھتا، اور پہلی گھنٹی بجتے ہی جواب دینے کے لیے لپکتا، اس خیال سے کہ کہیں روسا کبَرکَس ہی نہ ہو۔ میں اسے فون کرنے کے لیے جو کچھ بھی کر رہا ہوتا اسے بار بار روک دیتا، اور یہ عمل دنوں تک دہراتا رہا تا آنکہ مجھے محسوس ہوا کہ یہ ایک ایسا فون تھا جس کا دل نہیں تھا۔

ایک برساتی دوپہر لوٹنے پر دیکھا کہ بلّی باہری قدمچے پر کنڈلی مارے بیٹھی ہے۔ غلیظ، مضروب، اور اتنی منکسر کہ مارے ترحّم کے میرا دل بھر آیا۔ ہدایت نامے سے معلوم ہوا کہ بیمار ہے، اور میں نے اس کو آرام پہنچانے کے لیے دی گئی ہدایات پر عمل کیا۔ پھر جب میں قیلولہ کر رہا تھا، ایکا ایکی اس خیال نے مجھے جگا دیا کہ وہ دَیلگدینہ کے گھر تک میری راہ نمائی کر سکتی ہے۔ میں اسے سودے سلف والے جھولے میں ڈال کر روسا کبَرکَس کی دکان لایا، جو ہنوز مقفل اور زندگی کے آثار سے تہی تھی، لیکن بلّی جھولے میں اتنے شدید کدکڑے مار رہی تھی کہ بالآخر فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی، باغ کی دیوار کے اوپر چھلانگ لگائی، اور درختوں میں غائب ہوگئی۔ میں نے دروازے پر زور زور سے مٹھی مار کر دستک دی، اور ایک عسکری آواز نے بغیر دروازہ کھولے للکارا: کون ہے؟ دوست، میں نے جواب دیا، تاکہ اس سے پیچھے نہ رہوں۔ میں مالکہ کا متلاشی ہوں۔ کوئی مالکہ والکہ نہیں ہے، آواز نے کہا۔ کم از کم دروازہ تو کھولدو تاکہ میں اپنی بلّی لے لوں، میں نے اصرار کیا۔ یہاں کوئی بلّی نہیں، آواز نے کہا۔ میں نے پوچھا: تم کون ہو؟

''کوئی نہیں،'' آواز نے جواب دیا۔

میں نے ہمیشہ یہی سمجھا تھا کہ عشق میں مرنا محض شاعرانہ تصرّف ہے۔ اس دوپہر، واپس گھر میں، بلّی کے بغیر اور اس کے بغیر، میں نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ صرف ممکن ہی نہیں تھا بلکہ میں خود، ایک پیرِ فرتوت جو یکا و تنہا تھا، عشق میں مر رہا تھا۔ لیکن میں اس سے بھی آگاہ ہوا کہ اس کا الٹ بھی صحیح تھا: میں نے اپنے رنج و اَلم کی لذّتیں دنیا میں کسی چیز سے نہ بدلی ہوتیں۔ میں نے پندرہ سے زائد سال لیوپاردی کی نظموں کے ترجمے کی کوشش میں لگائے تھے، اور صرف اسی دوپہر مجھے ان کی گہرائی کا احساس ہوا: آہ، میں، اگر یہ محبت ہے، تو کیسی کیسی اذیّتیں پہنچاتی ہے۔

میرے پورے قد کا لبادہ پہنے اور بغیر ڈاڑھی مونڈے اخبار کے دفتر جانے نے میری ذہنی کیفیت کی بابت مخصوص شکوک کو ہوا دی۔ دفتر اپنی تعمیرِ نو میں، اپنے شیشے کے انفرادی کعبیوں اور سقفی روشن دانوں کے ساتھ، کسی زچّہ خانے کی طرح لگ رہے تھے۔ مصنوعی فضا، خاموش اور آرام دہ، سرگوشیوں میں بولنے اور پنجوں کے بل چلنے کی دعوت دے رہی تھی۔ لابی میں، مرے ہوئے وائسرایوں کی طرح، تین تاحیاتی ایڈیٹروں کی روغنی پورٹریٹس اور ممتاز ملاقاتیوں کی تصویریں لگی تھیں۔ بے حد وسیع صدر کمرے میں میری سالگرہ کی دوپہر لی گئی موجودہ ایڈیٹوریل عملے کی دیو پیکر تصویر چھائی ہوئی تھی۔ میں اس کا اُس تصویر سے ذہنی تقابل کرنے سے باز نہ رہ سکا جو اس وقت لی گئی تھی جب میں تیس سال کا تھا، اور ایک بار پھر میں نے دہشت کے ساتھ یہ تصدیق کی کہ آدمی کی عمر، حقیقت کے مقابلے میں، تصویروں میں زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے اور زیادہ شدّت کے ساتھ۔ جس سیکریٹری نے میری سالگرہ والی دوپہر مجھے بوسہ دیا تھا، اس نے پوچھا کہ کیا میں علیل ہوں۔ میں نے مسرت کے ساتھ راست گوئی سے کام لیا تا کہ وہ یقین نہ کرے: محبت سے بیمار۔ اس نے کہا: افسوس یہ میرے لیے نہیں! میں نے تحسین کا جواب تحسین سے دیا: اب اس پر اتنا یقین بھی نہ کرو۔

قانونی رپورٹر اپنے کعبیے سے یہ چلاتے ہوئے باہر آیا کہ شہر کے مردہ خانے میں دو ناشناختہ لڑکیوں کی لاشیں ہیں۔ اس سے ڈر کر، میں نے پوچھا: کس عمر کی؟ نوجوان، وہ بولا۔ یہ

اندر ونِ ملک سے آنے والی پناہ گیر ہوں گی جن کا حکومت کے غنڈے یہاں پیچھا کر رہے ہوں گے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ صورتِ حال چوری چھپے ہم پر رینگتی ہوئی آ رہی ہے، خون کے دھبّے کی طرح۔ قانونی رپورٹر، جواب فاصلے پر تھا، چلایا:

''خون نہیں، مائسترو، فضلا کہو۔''

چند دن بعد میرے ساتھ بہت برا ہوا، جب ایک تیز رفتار لڑکی، جس نے ایسی ہی ٹوکری اٹھائی ہوئی تھی جیسی بلّی کی تھی، منڈو بک اسٹور کے سامنے سے ایک تھرتھری کی طرح گزری۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا، دوپہر کے شوروغل میں ہجوم میں اپنی کہنیوں سے راستہ بناتے ہوئے۔ وہ بے حد حسین تھی، لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے وہ اس سیال روانی سے ہجوم کے درمیان راستہ نکال رہی تھی کہ مجھے اسے جا لینے میں کافی مشکل پیش آئی۔ آخرکار میں اس کے پاس سے گزرا اور اس کے چہرے میں جھانک کر دیکھا۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ سے ایک طرف ہٹا دیا، بغیر توقف کیے یا معذرت کیے۔ یہ وہ نہیں تھی جو میں نے سوچا تھا کہ ہوگی، لیکن اس کے گھمنڈی پن نے مجھے اس طرح زخمی کر دیا جیسے وہی ہو۔ ٹھیک اس وقت مجھ پر یہ کھلا کہ میں دیلگد ینہ کو حالت بیداری میں اور پیرہن پوش نہیں پہچان سکوں گا، نہ وہ مجھے ایسی حالتوں میں اگر مجھے پہلے نہ دیکھا ہوتا۔ دیوانگی کے ایک عمل میں، مَیں نے تین دن کے اندر اندر شیر خوار بچوں کی نیلی اور گلابی بوٹیوں کی بارہ جوڑیاں کروشیے سے بنا ڈالیں، اس کوشش میں کہ ان نغموں کو سن اور گا نہ سکوں، نہ ہی ان کے بارے میں سوچ سکوں، جو مجھے اس کی یاد دلاتے تھے۔

سچ یہ ہے کہ میں اپنی روح کو سنبھالنے کے قابل نہیں رہا تھا، اور میں محبت کے آگے اپنی کمزوری کے باعث بڑھاپے سے روشناس ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے اس کا اور زیادہ ڈرامائی ثبوت اس وقت مل گیا جب کاروباری علاقے کے بیچوں بیچ بس نے ایک سائیکل سوار لڑکی کو ٹکر مار دی۔ اسے ابھی ابھی ایمبولینس میں لے جایا گیا تھا، اور المیے کی سنگینی چمک دار خون کے گڑھے میں پڑی سائیکل کے بکھرے ہوئے پرزوں میں دیکھی جا سکتی تھی۔ لیکن یہ تباہ شدہ سائیکل نہیں تھی جس نے مجھے مت اُثر کیا تھا، بلکہ اس کی برانڈ، موڈل، اور رنگ۔ ہو نہ ہو یہ وہی تھی جو میں نے

وَیلگد ینہ کو دی تھی۔

گواہوں کا اتفاق تھا کہ مجروح سائیکل سوار بہت نوعمر تھی، دراز قامت اور دبلی پتلی، اور اس کے بال گھونگریالے اور کوتاہ ترشے ہوئے تھے۔ ہکّا بکّا، میں نے جو پہلی ٹیکسی نظر آئی اسے آنے کا اشارہ کیا اور اوسپتال دِکارِیداد جا پہنچا، جو ایک گیروے رنگ کی دیواروں والی پرانی سی عمارت تھی جو کسی ریگِ رواں میں دھنستے ہوئے کسی جیل خانے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ مجھے اندر داخل ہونے میں پورا آدھا گھنٹہ لگ گیا اور آدھا گھنٹہ اس پھل دار درختوں سے مہکتے ہوئے اس دالان سے نکلنے میں جہاں ایک آفت زدہ عورت میرا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی، میری آنکھوں میں دیکھا، اور آہ بھری:

''میں وہی ہوں جسے تم تلاش نہیں کر رہے۔''

تبھی مجھے یاد آیا کہ یہ وہ حصہ ہے جس میں بلدیاتی اسائلم کے غیر متشدّد مریض کسی روک تھام کے بغیر رہتے ہیں۔ قبل اس کے کہ نرس مجھے ایمرجینسی وارڈ میں لے جاتی، مجھے اسپتال کے انتظامیہ کو ایک رپورٹر کی حیثیت سے اپنی شناخت کروانی پڑی۔ معلومات داخلے کے رجسٹر میں درج تھیں: رسلبا ریوس، سولہ سال، ملازمت نامعلوم۔ تشخیص مرض: دماغی چوٹ۔ آئندہ کا حال: محتاط۔ میں نے وارڈ کے سربراہ سے پوچھا کہ اسے دیکھ سکتا ہوں، اپنے دل میں یہ تمنّا کرتے ہوئے کہ وہ نا کر دے گا، لیکن مجھے اس کے پاس لے جایا گیا، کیونکہ وہ اس بات سے کِھل اٹھے تھے کہ میں اسپتال کے ساتھ جو غفلت برتی جا رہی ہے اس کے بارے میں کچھ لکھوں گا۔

ہم نے ایک بے ترتیب وارڈ کو عبور کیا جس میں کاربولک ایسڈ کی بو پھیلی ہوئی تھی اور مریض بستروں میں ہجوم کیے ہوئے تھے۔ عقب میں، یک نفری کمرے میں، لوہے کی چارپائی پر وہ لڑکی پڑی ہوئی تھی جس کی ہم تلاش کر رہے تھے۔ اس کا سر پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا، چہرہ ناقابلِ شناخت، سوجا ہوا، اور چوٹوں کے نیل پڑا ہوا، لیکن یہ جاننے کے لیے کہ وہ دَیلگد ینہ نہیں مجھے صرف اس کے پیریوں کو دیکھنے کی ضرورت تھی۔ ٹھیک اُسی وقت مجھے خیال آیا کہ مجھے تعجب

کرنا چاہیے: اگر ہوتی تو میں کیا کرتا؟

ہنوز شب کے جالوں میں الجھا، اگلے روز میں نے اتنی ہمت کرلی کہ قمیص سازی کی فیکٹری میں جاؤں جہاں، ایک روز روسا کبرکس کے بتانے کے مطابق، لڑکی کام کرتی تھی، اور میں نے مالک سے اقوامِ متحدہ کے ایک پورے برِاعظم پر پھیلے ہوے پراجیکٹ کے لیے اپنی فیکٹری دکھانے کے لیے کہا۔ وہ ایک بھاری بھرکم، کم سخن لبنانی تھا جس نے اپنی راجدھانی کے دروازے اس خیالی امید کے ساتھ وا کردیے کہ دنیا کے لیے ایک مثال بن سکے گا۔

تین سو لڑکیاں، سفید بلاؤز پہنے اور پیشانیوں پر عیدالفصح کی صلیبیں لگائے، لمبے، روشن نافِ کلیسا جیسے کمرے میں بٹن ٹانک رہی تھیں۔ ہمیں آتے دیکھ کر وہ ایک دم سیدھی ہوکر بیٹھ گئیں، اسکول کی بچیوں کی طرح، اور کنکھیوں سے مینیجر کو بٹن ٹانکنے کے آرٹ میں جولازوال کارنامے اس نے انجام دیے ہیں کی وضاحت کرتا دیکھتی رہیں۔ میں نے ہر لڑکی کے چہرے کا بنظرِ غائر جائزہ لیا، اس دہشت ناکی سے کہ کہیں دیلگدینہ بیدار اور پیراہن پوش نظر نہ آجائے۔ لیکن یہ ان میں کی ایک تھی جس نے مجھے بے رحم تحیّر کی خوف آور نظر سے پہچان لیا:

''مجھے بتایئے، سنیور، کیا آپ وہی صاحب نہیں ہیں جو اخبار میں عشقیہ خطوط لکھتے ہیں؟''

میں کبھی یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ایک خوابیدہ لڑکی مجھ میں اس قدر تباہی لانے کا باعث ہوگی۔ میں خدا حافظ کہے یا یہ خیال کیے بغیر ہی فیکٹری سے بھاگ نکلا کہ برزخ کی ان عذراؤں میں آخرالامر وہ بھی تھی جسے میں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ میں جب باہر نکل رہا تھا اس وقت زندگی میں باقی بچ جانے والا واحد احساس رونے کی خواہش تھا۔

روسا کبرکس نے مہینے بھر بعد ایک ناقابلِ یقین توضیح کے لیے فون کیا: بینکر کے قتل کے بعد، اُس نے کارتاخینہ دِاِندیاس میں آرام کیا جس کو وہ پوری مستحق تھی۔ میں نے، ظاہر ہے، اس کی بات کا یقین نہیں کیا، لیکن میں نے اس کی خوش نصیبی پر اسے مبارک باد دی اور اپنے سینے میں اُبلتے سوال کو پوچھنے سے پہلے اسے اپنے دروغ کو تفصیلاً بیان کرنے دیا:

''وہ کیسی ہے؟''

روسا گبر کس بڑی دیر کے لیے خاموش ہوگئی۔ وہ ہے، اس نے آخر کار کہا، لیکن اس کی آواز میں گریز آ گیا: تمھیں کچھ انتظار کرنا ہوگا۔ کتنا؟ کہہ نہیں سکتی، میں تمھیں بتا دوں گی۔ مجھے لگا وہ میری گرفت سے نکلی جا رہی ہو، اور میں نے اسے بیچ ہی میں روک دیا: رکو، تمھیں اس پر کچھ روشنی ڈالنی ہوگی۔ کوئی روشنی ووشنی نہیں، وہ بولی، اور بات ختم کردی: ہوشیار رہنا، تم اپنا نقصان کر سکتے ہو اور، اس سے بڑھ کر، اس کا بھی۔ میں اس قسم کی کم آمیزی کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے صداقت کے قریب پہنچنے کا کم از کم ایک موقع ملنے کی حجت کی۔ آخر الامر، میں نے کہا، ہم دونوں ہی شریکِ جرم ہیں۔ اس نے ایک قدم نہیں بڑھایا۔ ڈھارس رکھو، وہ بولی، لڑکی بھلی چنگی ہے اور میرے بلانے کا انتظار کر رہی ہے، لیکن اس وقت کچھ نہیں ہوسکتا اور میں اس سے زیادہ کہنے والی نہیں۔ خدا حافظ۔

میں ٹیلیفون پکڑے رہ گیا، نہ جانتے ہوئے کہ اس معاملے میں آگے کیسے بڑھا جائے، کیونکہ میں اس سے اتنی اچھی طرح واقف تھا کہ احساس تھا کہ جب تک وہ نہیں چاہے گی مجھے اس سے کچھ نہیں ملے گا۔ بعد میں دوپہر کو میں چوری چوری اس کے گھر جا پہنچا، ہوش مندی سے زیادہ اتفاق پر اعتماد کرتے ہوئے، اور یہ اب بھی مجھے مقفل ہی ملا، کیونکہ شعبۂ صحت نے اسے بند کر رکھا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ روسا گبر کس نے مجھے کسی اور جگہ سے، شاید کسی اور شہر سے فون کیا ہو، اور محض اس خیال سے میں تاریک اندیشوں سے بھر گیا۔ لیکن اس شام چھ بجے، جب مجھے اِس کی کم سے کم توقع تھی، اس نے ٹیلیفون پر میرا اپنا معینہ اشارہ دیا:

''اچھا، آج ہی کے دن۔''

اس رات دس بجے، لرزاں اور رونے سے باز رہنے کے لیے ہونٹ کاٹتے ہوئے، میں سوئس چاکلیٹ کے ڈبے، نوگٹ مٹھائی، کینڈیز، اور بستر پر پھیلانے کے واسطے آتشیں رنگ پھولوں کی ٹوکری لیے وارد ہوا۔ دروازہ نیم وا تھا، بتیاں روشن تھیں، اور ریڈیو پر برامس کا First Sonata for Violin and Piano نیم صدا میں دھیما بج رہا تھا۔ بستر میں

دیلگدینہ اتنی تاب ناک اور اتنی مختلف نظر آ رہی تھی کہ اسے پہچاننے میں دشواری ہوئی۔

وہ بڑھ گئی تھی، لیکن یہ اس کے قدوقامت سے اتنا ظاہر نہیں ہو رہا تھا جتنا اس شدید بلوغت سے جس کے باعث وہ دو تین سال بڑی نظر آ رہی تھی، اور پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ برہنہ۔ اس کے رخساروں کی اٹھی ہوئی ہڈیاں، ناہموار سمندروں کے سورجوں سے سنولائی ہوئی اس کی جلد، اس کے نازک ہونٹ، اور اس کے کوتاہ ترشے ہوئے گھونگریالے بالوں نے اس کے چہرے کو پرکسیتلیس کے اپالو کی ذوجنسی شان وشوکت سے سیراب کر دیا تھا۔ لیکن کوئی مبہم بیانی ممکن نہیں تھی، کیونکہ اس کے دودھ اتنا بڑھ گئے تھے کہ میرے ہاتھ میں سما نہ سکے، اس کے کولھوں کی نشوونما اپنی تکمیل کو پہنچ چکی تھی، اور اس کی ہڈیاں نسبتاً زیادہ ٹھوس اور مربوط ہو گئی تھیں۔ میں فطرت کے ان کارناموں سے مسحور ہو گیا لیکن عیاری سے دم بخود: نقلی پلکیں، اس کی ہاتھ اور پیروں کی انگلیوں کے ناخنوں پر صدف رنگ پالش، اور ایک سستی سے خوشبو جس کا محبت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ تاہم، جس چیز نے مجھے پاگل کر دیا وہ وہ زیورات تھے جو اس نے پہنے ہوئے تھے: سونے کے آویزے جن میں زمرّد کی بھرمار تھی، سچے موتیوں کا ہار، سونے کا پہنچا جو ہیروں سے جگمگا رہا تھا، اور ہر انگلی پر معیاری جواہرات کی انگشتریاں۔ کرسی پر اس کا شام کا ڈریس پڑا تھا جو ستاروں اور زردوزی سے بھرا تھا، اور اس کے ساٹن کے سلیپر۔ میرے اندر کہیں گہرائی سے ایک گھمبیر ابھری۔

"رنڈی!" میں چلّایا۔

کیونکہ شیطان نے میرے کان میں ایک گھناؤنے گمان کی سرگوشی کی۔ اور وہ تھا: جرم کی رات، روسا کبرکس کے پاس لڑکی کو متنبہ کرنے کے لیے نہ وقت رہا ہوگا نہ دماغ، اور پولیس نے اسے کمرے میں پایا ہوگا، تنہا، ایک نابالغ، جس کے پاس اپنی برائت کا کوئی عذر نہ ہو۔ لیکن اس قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے میں بھلا کون روسا کبرکس کا مقابلہ کرسکتا ہے: جرم سے برائت حاصل کرنے کے عوض اس نے لڑکی کی بکارت اپنے کسی نامی گرامی گاہک کو بیچ دی ہوگی۔ اوّل اوّل، ظاہر ہے، اسی میں بہتری تھی کہ نگاہوں سے اوجھل ہو جایا جائے تا آنکہ

فضیحت دب دبا جائے۔ واللہ کیا کہنے! تین نفری ماہِ عسل، وہ دونوں بستر میں، اور روسا گبرَگس شاہانہ ٹیرس پر بیٹھی اپنی خوش نصیب بریّت سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔ احمقانہ غیظ و غضب سے اندھے ہو کر، میں نے کمرے کی ہر شے کو دیوار سے دے مارنا شروع کر دیا: لیمپ، ریڈیو، پنکھا، آئینے، جگ، گلاس۔ میں نے اس عمل میں جلد بازی نہیں دکھائی، لیکن وقفہ بھی نہیں آنے دیا، زوردار دھماکوں چھناکوں اور بڑی باضابطہ ازخود رفتگی کے ساتھ جنھوں نے میری جان بچالی۔ لڑکی پہلے دھماکے کو سن کر چونک پڑی لیکن میرے طرف دیکھا نہیں؛ بلکہ اپنی پیٹھ کر لی اور اسی حالت میں رہی، رک رک کر اس کا جسم دھڑک اٹھتا، تا آنکہ دھماکے بند ہو گئے۔ صحن میں مرغیاں اور رات گئے کے کتّے غل غپاڑے میں اضافہ کر رہے تھے۔ طیش کی خیرہ کن تابانی میں مجھے یہ آخری الہامی خیال آیا کہ گھر کو آگ لگا دوں کہ روسا گبرَگس کا جذبات سے عاری ہیولیٰ، نائٹ گاؤن میں ملبوس، دروازے میں ظاہر ہوا۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے نظروں ہی نظروں میں تباہی کی فہرست مرتّب کی اور یہ تصدیق کی کہ لڑکی گھونگھے کی طرح دبکی پڑی ہے، سر بازوؤں میں چھپا ہوا: دہشت زدہ لیکن صحیح سلامت۔

''میرے خدا!'' روسا گبرَگس نے آہ بھری۔ ''ایسی محبت کے لیے میں کیا کچھ نہ دے دیتی!''

اس نے سر سے پیر تک مجھے ترحّم کی نظر سے دیکھا اور حکم دیا: چلو، چلیں۔ میں اس کے پیچھے پیچھے گھر میں آیا، اس نے خاموشی کے ساتھ گلاس میں میرے لیے پانی ڈال، اپنے مقابل بیٹھ جانے کا اشارہ کیا، اور میرا اعتراف سننے کی تیاری کی۔ اچھا، وہ بولی، ایک بالغ کی جون میں آؤ اور ٹھیک بتاؤ کہ کیا بات ہے۔

جسے میں اپنی الہامی حقیقت سمجھتا تھا وہ میں نے اسے بتادی۔ روسا گبرَگس خاموشی سے میری بات سنتی رہی، بغیر کسی حیرت کے، اور آخر کار لگا جیسے یہ اس کی سمجھ میں آ گئی ہو۔ کمال کی بات ہے، اس نے کہا۔ رقابت حقیقت سے زیادہ جانتی ہے۔ اور پھر، بغیر لگی لپٹی رکھے، اس نے ساری بات بتادی۔ حقیقت میں، وہ بولی، جرم کی رات وہ اس قدر حواس باختہ تھی کہ کمرے میں

سوئی لڑکی کو بھول بھال گئی تھی۔ اس کے ایک گاہک نے، جو مقتول کا وکیل بھی تھا، اور بڑی فیاضی سے فوائد اور رشوتیں تقسیم کرتا پھرتا تھا، روسا گبرگس کو دعوت دی کہ کارتاخینہ دِ انڈیاس کے ایک پرسکون ہوٹل میں آکر فضیحتے کے دب جانے تک قیام کرے۔ یقین جانو، روسا گبرگس نے کہا، اس تمام مدت میں مَیں ایک لمحے کے لیے بھی تمھارے اور لڑکی کے خیال سے غافل نہیں رہی۔ میں پرسوں لوٹی اور سب سے پہلے تمھیں فون کیا، لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے برخلاف، لڑکی فوراً آ گئی، اس بری حالت میں کہ میں نے اسے تمھارے واسطے نہلایا، تمھارے واسطے کپڑوں سے آراستہ کیا، تمھارے واسطے ہیئر ڈریسر کے پاس بھیجا، اور کہا کہ اسے اتنی زیبا بنا دو جتنی ایک ملکہ ہوتی ہے۔ تم نے دیکھا وہ کیسی لگ رہی تھی: بالکل کامل۔ اس کا پُرتکلف لباس؟ انھیں میں کا جو میں اپنی غریب ترین لڑکیوں کو کرائے پر دیتی ہوں جب انھیں کسی گاہک کے ساتھ رقص پر جانا پڑ جاتا ہے۔ جواہرات؟ وہ میرے ہیں، وہ بولی: بس تمھیں اتنا ہی کرنا ہے کہ انھیں چھو کر دیکھو اور پتا چل جائے گا کہ جواہر شیشہ ہیں اور سونا چاندی ٹین۔ تو منھ بسورنا چھوڑو، اس نے قطعی فیصلہ سنا دیا: جاؤ، اسے جگاؤ، اس سے معافی مانگو، اور ہمیشہ کے لیے اس کے ضامن و حامی بن جاؤ۔ تم دونوں سے زیادہ کوئی اور شادکامی کا مستحق نہیں۔

میں نے اس پر یقین کر لینے کی ایک فوق البشری کوشش کی، لیکن محبت عقل سے زیادہ طاقت ور تھی۔ رنڈیاں! میں نے کہا، اس زندہ شعلے سے اذیّت زدہ ہو کر جو میرے شکم میں بھڑک رہا تھا۔ یہ ہو تم لوگ! میں نے چلا کر کہا: جہنمی رنڈیاں! میں تمھارے بارے میں اور کچھ نہیں جاننا چاہتا، یا دنیا کی کسی اور فاحشہ کے بارے میں، اور اُس کے بارے میں تو اور بھی کم۔ میں نے دروازے کے پاس سے ایک اشارہ کیا: خداحافظ، ہمیشہ کے لیے۔ روسا گبرگس نے اس پر شک نہیں کیا۔

''اللہ بیلی،'' وہ بولی، غمگینی سے منھ بناتے ہوے، اور اپنی حقیقی زندگی کی طرف لوٹ گئی۔ ''بہرصورت، کمرے میں جو توڑ پھوڑ کی ہے اس کا بل میں تمھیں بھیج دوں گی۔''

—۵—

The Ides of March پڑھتے ہوے میری نظر ایک بدشگون جملے پر جا پڑی جو مصنف جولیس سیزر سے منصوب کرتا ہے: آخر میں، آدمی کا وہی بن جانا جیسا لوگ اسے سمجھتے ہیں ناگزیر ہے ۔ میں اس جملے کی اصل کی تصدیق جولیس سیزر کی خود اپنی نگارشات میں کر سکا نہ اس کے سوانح نگاروں کی، سیوتونیوس سے لے کر کارکوپینوس تک، لیکن یہ جاننے کے قابل ضرور تھا۔ اس کی جبریت نے، اگر اس کا اطلاق میری زندگی کی اس سمت پر کیا جائے جس پر وہ آنے والے مہینوں میں گامزن رہی، مجھے وہ عزم عطا کیا جس کی ضرورت مجھے نہ صرف اس لیے تھی کہ اپنی یادوں کو قلم بند کروں بلکہ اس لیے بھی کہ انھیں، دیلگدینہ سے اپنی محبت کے ساتھ، بغیر کسی ہچکچاہٹ کے شروع کروں۔

میرا صبر وقرار بالکل جاتا رہا، میں نے کھانا تقریباً ترک کر دیا، اور میرا وزن اتنا کم ہو گیا کہ پتلون کمر کے گرد ڈھیلی پڑ گئی۔ میری ہڈیوں میں وقت بے وقت درد اٹھنے لگا، میرا موڈ خواہ مخواہ بدل جاتا، راتیں ایسی خیرگی کے عالم میں گزارتا کہ نہ کچھ پڑھ سکتا نہ موسیقی سن سکتا، جب کہ دن ایسی حواس باختہ غنودگی میں سر جھٹک جھٹک کر برباد کرتا جو نیند تک میری قیادت نہ کرتی۔

اس آزار سے مخلصی بالکل اچانک طور پر ہوئی۔ لوما فریسکا کی کھچا کھچ بھری بس میں، میرے برابر بیٹھی عورت نے، جسے میں نے سوار ہوتے نہیں دیکھا تھا، میرے کان میں سرگوشی کی: ہنوز جفتی کررہے ہو؟ یہ کاسِلدا آرمینتہ تھی، ایک پرانی کرائے کی ٹٹو جس نے مجھے ایک مستقل مزاج گاہک کے طور پر اس وقت سے برداشت کیا تھا جب وہ ایک نوخیز اور گھمنڈی لڑکی تھی۔ جب وہ اپنے دھندے سے سبک دوش ہوگئی، بیمار اور قلاش، تو ترکاریوں کی کاشت کرنے والے ایک چینی سے شادی کرلی جس نے اسے اپنا نام اور سہارا دیا، اور شاید تھوڑی سی محبت بھی۔ تہتر سال کی عمر میں اس کا وہی وزن تھا جو ہمیشہ رہا تھا، اب بھی اتنی ہی حسین تھی، کردار کی مضبوط، اور اپنے کاروبار کے بے باک اندازِ تکلّم کو ہنوز برقرار رکھے ہوئے تھی۔

وہ مجھے اپنے گھر لے گئی، چینی مزدوروں کا فارم جو سمندر کی طرف جانے والی سڑک کے برابر کی پہاڑی پر تھا۔ ہم بیچ چیئرز پر سایہ دار ٹیرس پر بیٹھے گئے، جو سرخس اور ایلسترو ئے میریاس کے پتوں سے گھری تھی، اور پرندوں کے پنجرے چھجے سے لٹکے ہوئے تھے۔ پہاڑی والی طرف آتشیں سورج کے نیچے چینی کاشت کار سروں پر مخروطی ہیٹ لگائے سبزیاں بوتے دیکھے جاسکتے تھے، اور بوکاس دِسینیسا کا پانی جس پر دریا کی بہت دور تک سمندر میں قیادت کرنے کے لیے دو پتھریلے پشتے بنے تھے۔ دورانِ گفتگو ہم نے ایک سفید مسافر بردار جہاز کو مخرج میں داخل ہوتے دیکھا۔ اور ہم خاموشی میں اپنی نگاہوں سے اس کا تعاقب کرتے رہے تا آنکہ دریائی بندرگاہ میں اس کی غم ناک بیل کی ڈکار سنائی دی۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ تمھیں کچھ پتا ہے؟ نصف صدی میں یہ پہلی بار ہے کہ میں تمھاری پذیرائی اپنے بستر میں نہیں کررہی ہوں۔ ہم وہ نہیں رہے جو ہوا کرتے تھے، میں نے کہا۔ وہ مجھے سنے بغیر بولتی رہی: جب بھی ریڈیو پر تمھارا ذکر ہوتا ہے، اس الفت پر تمھیں دادِ تحسین پیش کی جاتی ہے جو لوگ تمھارے لیے محسوس کرتے ہیں، تمھیں ماہرِ عشق کے لقب سے یاد کرتے ہیں، ذرا تصوّر تو کرو، میں سوچتی ہوں کہ تمھاری دل ربائیوں، تمھارے خبطوں کو بھلا کوئی اور اتنی اچھی طرح کیا جانتا ہوگا جتنی اچھی طرح میں جانتی تھی۔ میں یہ سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں، وہ بولی، کسی اور نے مجھ

سے بہتر تم سے نباہ نہیں کیا ہوتا۔

اور زیادہ برداشت کرنے کی مجھے میں تاب نہیں تھی۔ اس نے بھی یہ محسوس کیا، میری آنکھوں کو دیکھا جو آنسوؤں سے نم تھیں، اور صرف تبھی یہ دریافت کیا ہوگا کہ میں وہ نہیں رہا تھا جو پہلے تھا، اور میں نے اس کی نگاہ کو ایسی حوصلہ مندی سے برداشت کیا جو میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میرے اندر ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ میں بوڑھا ہوتا جارہا ہوں، میں نے کہا۔ ہم پہلے ہی سے بوڑھے ہیں، اس نے ایک آہ بھر کے کہا۔ ہوتا یہ ہے کہ تم باطن میں اسے محسوس نہیں کرتے، لیکن باہر سے ہر کس و ناکس دیکھ سکتا ہے۔

یہ ناممکن تھا کہ اپنا دل کھول کر نہ رکھ دوں، چنانچہ میں نے اسے پوری رام کہانی سنا دی جو میرے اندر گہرائی میں بھڑک رہی تھی، اپنی نوے ویں سالگرہ سے پہلے والے دن روسا گبر گس کو ٹیلیفون کرنے سے لے کر اس المیہ رات تک جب میں نے کمرے میں توڑ پھوڑ مچائی تھی اور کبھی وہاں لوٹ کر نہیں گیا تھا۔ وہ مجھے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا سنتی رہی اس طرح جیسے یہ سب اسی پر بیتی ہو، اس پر بغیر جلد بازی کے غور کیا، اور آخر میں مسکرائی۔

''جو چاہے کرو، لیکن اس بچّی کو ہاتھ سے جانے نہ دینا،'' وہ بولی۔ ''تن تنہا مرنے سے زیادہ کوئی اور بدقسمتی نہیں۔''

ہم اس چھوٹی سی کھلونا ریل گاڑی میں پیورتو کولومبیا گئے جو کسی گھوڑے کی سست رفتاری سے چل رہی تھی۔ گرم خوردہ چوبی عرشے کے اس پار ہم نے لنچ کھایا جہاں سے ہر کوئی بوکاس دِسینیسا کی گاد نکالے جانے سے پہلے ملک میں داخل ہوا تھا۔ ہم پام کی ایک چھت کے نیچے بیٹھے جہاں بڑے ڈیل ڈول والی کالی منتظمائیں تلی ہوئی سرخ اِسنیپر مچھلیاں ناریل کے چاولوں اور سبز کیلے کے قتلوں کے ساتھ پیش کررہی تھیں۔ ہم دو بجے کی گاڑھی مجہولیت میں جھونکے کھانے لگے لیکن باتیں جاری رکھیں تا آنکہ بے حد جسیم آتشیں سورج سمندر میں غروب ہوگیا۔ حقیقت مجھے ایک گرہِ خیال معلوم ہوئی۔ دیکھو تو سہی، ہمارے ماہِ عسل کا کیا انجام ہورہا ہے، اس نے استہزا کیا۔ لیکن پھر وہ گمبھیر ہوگئی: آج میں مڑ کر دیکھتی ہوں، مجھے ہزاروں مردوں کی ایک

قطار نظر آتی ہے جو میرے بستر سے گزرے، اور ان میں سے بدترین کے ساتھ بھی رہنے کے لیے میں نے اپنے روح دے دی ہوتی۔ خدا کا شکر کہ مجھے اپنا چینی وقت پر مل گیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اپنے چھنگلی سے بیاہ کرنا، لیکن وہ کل کا کل میرا ہے۔

اس نے میری آنکھوں میں نظر گاڑ کر دیکھا، ابھی ابھی جو کہا تھا اس پر میرے ردِعمل کا اندازہ لگایا، اور بولی: تو تم جاؤ اور ابھی ابھی اس بے چاری مخلوق کو ڈھونڈ نکالو، چاہے تمھاری رقابت جو کہتی ہے صحیح کیوں نہ ہو، کچھ بھی ہوجائے، وہ رقص جو تم اس کے ساتھ کر چکے ہو، کوئی تم سے واپس نہیں لے سکتا۔ لیکن ایک بات کا خیال رہے، نانا دادا والی رومانیت نہ بگھارنا۔ اسے جگاؤ، شیطان نے ڈرپوکی اور بخیلی کی جزا کے طور پر جو لدّو گدھے کا ذَکر تمھیں عنایت کیا ہے اس سے جفتی کر کر کے اس کا پلیتھن نکال دو۔ میں بالکل سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں، اس نے بات ختم کرتے ہوے کہا، اور دل لگی کہہ رہی ہوں: محبت کے ساتھ جفتی کرنے کی سعادت کو جانے بغیر مت مرجانا۔

اگلے دن جب میں نے فون کا ڈائل گھمایا تو میرا ہاتھ کانپ رہا تھا، نہ صرف اس تناؤ کی وجہ سے جو دَیلگد ینہ سے دوبارہ ملاپ کے باعث تھا، بلکہ اس غیر یقینی کی وجہ سے بھی کہ روسا گَبرکَس کا کیا ردِعمل ہوگا۔ وہ نقصان جو میں نے اس کے کمرے کو پہنچایا تھا اس کے بے جا ہرجانے پر ہماری بڑی سخت تکرار ہوچکی تھی۔ مجھے اپنی ماں کی ایک بے حد پسندیدہ پینٹنگ فروخت کرنی پڑی تھی، جو تخمیناً بڑی بھاری قیمت کی تھی لیکن حقیقت کے لمحے میں میری متوقع قیمت کے عُشرِ عَشیر سے زیادہ نہیں۔ میں نے اپنا بقیہ اندوختہ ملا کر اس رقم میں اضافہ کیا اور ایک ناقابلِ مرافعہ الٹی میٹم کے ساتھ اسے لے کر روسا گَبرکَس کے پاس پہنچا: لینا ہے تو لے لو ورنہ کچھ بھی نہیں ملنے کا۔ یہ ایک خودکشی کے مرادف عمل تھا، کیونکہ اگر وہ میرا ایک راز بھی بیچ دیتی تو میری عزت و آبرو پر کلنک کا ٹیکا لگ جاتا۔ اس نے حجت تو نہیں کی، لیکن ہمارے جھگڑے کی رات جو پینٹنگز اس نے ضمانت کے طور پر رکھوالی تھیں انھیں اپنے پاس ہی رہنے دیا۔ ایک واحد ڈرامے میں مَیں تنہا گھاٹا اٹھانے والا تھا: نہ دَیلگد ینہ میرے پاس رہی تھی، نہ روسا گَبرکَس، اور

بچی بچائی پونجی ہی۔ تاہم، میں نے فون کی گھنٹی کو بجتے ہوئے سنا، ایک بار، دو بار، تین بار، اور آخر کار اس نے کہا: ہاں؟ میری آواز قابو سے جاتی رہی۔ میں نے فون بند کردیا۔ ہیمک میں جا بیٹا، سُستی کے راہبانہ تغزل سے اپنی سکون کو بحال کرنے کی کوشش کی، اور پسینے میں اتنا نہا گیا کہ ہیمک کا کینوس تک تربتر ہوگیا۔ اگلے دن سے پہلے مجھے دوبارہ فون کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

''اچھا، عورت،'' میں نے مستحکم آواز میں کہا، ''آج کے دن۔''

روسا گبرکس، ظاہر ہے، ہر چیز سے بالا تھی۔ آہ، میرے غم زدہ اسکالر، اور اس نے اپنی پسپا نہ ہونے والی روح کے ساتھ سرد آہ بھری، تم دو ماہ کے لیے غائب ہوجاتے ہو اور صرف چھلاوں کے تعاقب میں لوٹتے ہو۔ اس نے بتایا کہ ایک ماہ سے اس نے دیلگدینہ کی نہیں دیکھا ہے، کہ لڑکی میری تباہ کاری پر اپنی دہشت سے اتنے مکمل طور پر بحال ہوگئی تھی کہ پلٹ کر اس کا کبھی ذکر تک نہیں کیا تھا اور نہ میرا پوچھا تھا، اور اپنی نئی ملازمت سے بے حد خوش تھی، جو بٹن ٹانکنے کے مقابلے میں زیادہ آرام دہ اور اجرت والی تھی۔ ایک زندہ آگ کی لہر میرے اندر شعلہ زن ہوگئی۔ ہو نہ ہو وہ طوائف کا کام ہی کررہی ہوگی، میں نے کہا۔ روسا نے پلک جھپکے بغیر جواب دیا: احمق نہ بنو، اگر یہ سچ ہوتا تو اسے یہاں ہونا چاہیے تھا۔ اس سے زیادہ بہتر اور کونسی جگہ اس کے لیے ہوسکتی ہے؟ اس کی منطق کی سرعت نے میرے شکوک کو بدتر کردیا: اور مجھے کیسے معلوم ہوسکتا ہے کہ یہاں نہیں ہے؟ اگر یہاں ہے، اس نے جواب دیا، تو اس نہ جاننے میں ہی تمھاری بھلائی ہے۔ ٹھیک نہیں؟ ایک بار پھر مجھے اس سے نفرت محسوس ہوئی۔ وہ سرزور تھی اور اس نے لڑکی کا پتا لگانے کا وعدہ کیا۔ لیکن کامیابی کی امید کم ہی تھی، کیونکہ ہمسائے کا فون جس پر وہ اس سے بات کرتی تھی منقطع کردیا گیا تھا اور اسے لڑکی کے مکان کی کوئی سن گن نہیں تھی۔ لیکن یہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ آدمی مر جائے، کیا جاتا ہے، وہ بولی، میں گھنٹہ بھر میں تمھیں فون کرتی ہوں۔

یہ گھنٹہ تین دن لمبا ہوگیا، لیکن اس نے لڑکی کو تندرست اور تیار ڈھونڈ نکالا۔ میں لوٹ آیا، شرمندہ، اور اس کے انچ انچ پر بوسے ثبت کیے، کفّارے کے طور پر، رات کے بارہ بجے

سے لے کر مرغوں کے لکڑوں کوں کرنے کے وقت تک۔ مجھے معاف کر دو جو میں نے اپنے سے وعدہ کیا تھا ہمیشہ دہراتا رہوں گا، اور یہ ایسا تھا جیسے بارِ دگر پہلے سے ابتدا ہو رہی ہو۔ کمرہ اپنے سازوسامان سے محروم کر دیا گیا تھا اور بیدردانہ استعمال نے ہر چیز جو میں نے مہیّا کی تھی تباہ کر دی تھی۔ روسا گبرَکس نے اسے اسی حالت میں رہنے دیا تھا اور بولی کہ اس کی سدھار سنوار میرے ذمے ہوگی اس کی رقم کی ادائیگی کے طور پر جو ہنوز مجھ پر نکلتی تھی۔ دوسری طرف، میری اقتصادی حالت تحت الثریٰ کو پہنچی ہوئی تھی۔ پینشن سے آنے والی رقم سے کفالت کم سے کم ہو رہی تھی۔ دو چار قابلِ فروخت اشیا جو گھر میں بچ رہی تھیں میری ماں کے مقدس زیورات کو چھوڑ کر ان کی کوئی تجارتی قیمت نہیں تھی، اور کوئی چیز اتنی پرانی نہیں تھی کہ اسے نوادرات میں شمار کیا جا سکے۔ بھلے دنوں میں، گورنر نے شعبہ جاتی لائبریری کے لیے میری یونانی، لاطینی، اور ہسپانوی کلاسیکس کی کتابیں اکھٹی خریدنے کی للچا دینے والی پیشکش کی تھی، لیکن انھیں بیچ دینے کے لیے میرا دل نہ مانا۔ بعد میں، سیاسی تبدیلیوں اور دنیا کے انحطاط کی رعایت سے، حکومت میں کسی کو فنون پر توجہ دینے کا خیال آیا نہ ادب پر۔ کسی مناسب حل کی تلاش سے تھک کر، دَیلگدینہ نے جو زیور لوٹا دیے تھے انھیں جیب میں ڈالا اور گروی رکھنے ایک منحوس گلی میں پہنچا جو عوامی بازار تک جاتی تھی۔ کسی بدحواس اسکالر کی ادا سے میں اس غارِ جہنم کے اِس سرے سے اُس سرے تک آگے پیچھے چکر لگانے لگا جو بوسیدہ شراب خانوں، استعمال شدہ کتابوں کی دکانوں، اور گروی گھروں سے ٹھساٹھس بھری تھی، لیکن فلورینہ دِ دیوس کا وقار میرے آڑے آ گیا: میری ہمت نہ ہوئی۔ تب میں نے انھیں باعزت طور پر سب سے پرانی اور نیک نام زیورات کی دکان کے ہاتھوں بیچنے کا فیصلہ کیا۔

سیلز مین نے اپنے اکتالے شیشے سے ان کا معائنہ کرتے ہوئے مجھ سے چند سوال کیے۔ اس کا ہیبت طاری کر دینے والا رنگ ڈھنگ کسی معالج کا سا تھا۔ میں نے بتایا کہ یہ زیورات مجھے اپنی ماں کے ورثے میں ملے ہیں۔ اس نے میری ہر وضاحت کو ایک غراہٹ کے ساتھ تسلیم کیا، اور آخرِ کار اکتالہ شیشہ آنکھ سے جدا کیا۔

''مجھے افسوس ہے،'' اس نے کہا، ''لیکن یہ بوتلوں کے پیندے ہیں۔''

مجھے ہکّا بکّا دیکھ کر اس نے بامروّت دردمندی سے کہا: اچھا ہی ہے کہ سونا سونا ہے اور پلاٹینم پلاٹینم۔ میں نے اپنی جیب تھپتھپائی تاکہ پکّا کرلوں کہ خرید کی رسیدیں ساتھ لیتا آیا ہوں، اور میں نے بغیر کسی قیل وقال کے کہا:

''خیر، یہ اسی باعزت دکان سے سو سال سے اوپر ہوئے خریدے گئے تھے۔''

اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ایسا اتّفاق اکثر ہوتا ہے، وہ بولا، کہ موروثی زیورات میں سب سے قیمتی جواہر وقت کے ساتھ ساتھ غائب ہوجاتے ہیں، جنھیں خاندان کے گمراہ اراکین یا جرائم پیشہ جوہری نقلی مال سے بدل دیتے ہیں، اور اس جعل کا پتا صرف اسی وقت چلتا ہے جب کوئی انھیں بیچنے کے لیے لاتا ہے۔ مجھے ایک لمحے کی مہلت دو، اس نے کہا، اور زیورات کو لے کر عقبی دروازے سے اندر گیا۔ چند ثانیوں کے بعد لوٹا، اور بغیر کوئی وضاحت کیے مجھ سے بیٹھ جانے کے لیے کہا، اور اپنا کام جاری رکھا۔

میں نے دکان پر ایک انتقادی نظر ڈالی۔ میں یہاں اپنی ماں کے ساتھ کئی بار آیا تھا، اور مجھے ایک فقرہ یاد آیا جو بار بار دہرایا گیا تھا: اپنے ابّا کو مت بتانا۔ ناگہانی ایک خیال آیا جس نے مجھے بے کل کردیا: نہیں ہوسکتا تھا کہ روسا کبرکس اور ڈیلگدینہ نے باہم رضامندی سے اصلی جواہرات بیچ دیے ہوں اور زیورات مجھے نقلی جوہروں کے ساتھ لوٹا دیے ہوں؟

شکوک میرے اندر کھلبلی مچائے ہوئے تھے کہ ایک سیکریٹری نے مجھے اُسی عقبی دروازے سے اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا، ایک چھوٹے سے دفتر میں جہاں لمبی مبی شیلوفوں پر موٹی موٹی جلدیں رکھی تھیں۔ دور کی میز کے پاس ایک لحیم شحیم بڈّو نے کھڑے ہوکر میرا ہاتھ ملایا، اور کسی رفیقِ دیرینہ کی سی گرم جوشی سے مجھے تم سے مخاطب کیا۔ ہم ثانوی اسکول میں ساتھی تھے، اس نے خوش آمدید کے طور پر کہا۔ اسے یاد رکھنا آسان تھا: وہ اسکول میں ساکر کا بہترین کھلاڑی تھا اور ہمارے اوّلین رنڈی گھروں کا معرکہ مار۔ کسی وقت مَیں اس سے بے خبر ہوگیا تھا، اور میں اسے اس قدر بڈھا کھونسٹ نظر آیا ہوں گا کہ اس نے مجھے اپنے کسی ہم جماعت سے

خلط ملط کر دیا تھا۔

ڈیسک کی شیشے کی اوپری سطح پر دستاویزی جلدوں میں کی ایک گرانڈیل جلد کھلی ہوئی تھی جس میں میری ماں کے زیورات کا کچا چٹھا درج تھا۔ ایک بے کم و کاست بیان، تاریخوں اور تفصیلات کے ساتھ کہ کس طرح خود اس نے ذاتی طور پر دونسلوں کے مؤقر کارگمنتوس کے جواہرات بدل دیے تھے، اور اصلی جواہرات اسی دکان کو بیچ دیے تھے۔ یہ ماجرا اس وقت ہوا جب دکان کے موجودہ مالک کا باپ دکان کا کرتا دھرتا تھا اور وہ اور میں اسکول میں تھے۔ لیکن اس نے مجھے دلاسا دلایا: آڑے وقتوں میں گاہے بگاہے ہنگامی مالی دقتوں سے عزت کی قربانی دیے بغیر عہدہ برا ہونے کے لیے اس قسم کی چھوٹی موٹی چالیں معزز گھرانوں کا عام طرزِ عمل تھیں۔ اس ناگوار حقیقت کے سامنے، کسی اور فلورینہ دِدیوس کی یادگار کے طور پر، جس سے میں کبھی واقف نہیں رہا تھا، میں نے انھیں اپنے پاس ہی رکھنے کو ترجیح دی۔

جولائی کے شروع میں مَیں نے اپنی موت سے اپنے واقعی فاصلے کو محسوس کیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور مجھے اپنے چاروں طرف اپنے خاتمے کی بالکل واضح نشانیاں نظر آنے اور محسوس ہونے لگیں۔ ان میں سے واضح ترین بے لیاس آرٹس میں منعقد ہونے والے کانسرٹ کے دوران پیش آئی۔ ایئر کنڈیشنگ خراب ہوگئی تھی، اور کھچا کھچ بھرے ہال میں فنون اور ادب کے ممتاز لوگ دہرے جوش دان میں پڑے کھدبدا رہے تھے، لیکن موسیقی کے طلسم نے ایک الوہی فضا قائم کر دی تھی۔ خاتمے پر، جب موسیقی Allegretto poco mosso میں داخل ہوتی ہے، مجھے زناٹے کے اس الہام نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ مرنے سے پہلے یہ آخری کانسرٹ ہے جو تقدیر مجھے پیش کر رہی ہے۔ میں نے غم محسوس کیا نہ خوف بلکہ اتنی عمر پانے پر کہ اسے تجربہ کر سکوں ایک بے پناہ جذبہ۔

جب آخر الامر، پسینے میں شرابور، بغل گیریوں اور تصویروں کے نرغے سے باہر نکلا، تو حیرت کی بات ہے کہ میری خمینہ اورتیس سے مڈبھیڑ ہوگئی، جو کسی صد سالہ دیوی کی طرح اپنی معذوروں کی کرسی میں بیٹھی تھی۔ محض اس کی موجودگی نے گناہِ کبیرہ کی طرح اپنا سارا بوجھ مجھ پر

لا دیا۔ اس نے عاج رنگ ریشم کا، جو اس کی جلد کی طرح ہموار تھا، ٹیونک پہنا ہوا تھا، اور سچے موتیوں کی سہ حلقی لڑی، صدف رنگ بال جو ۱۹۲۰ کی دہائی کی طرز میں تراشے گئے تھے، رخسار پر سمندری بگلے کے پَر کا سرا، اور بڑی بڑی زرد آنکھیں جو سیاہ حلقوں کے فطری سایے سے درخشاں تھیں۔ اس کی ہر چیز اس افواہ کی تردید کرتی تھی جس کے مطابق اس کا دماغ اس کے حافظے کے ناقابلِ بازیافت زوال کی وجہ سے خالی ہوتا جارہا تھا۔ خوف سے مفلوج اور اس کے سامنے عہدہ برا ہونے کی کسی بھی صلاحیت سے عاری، میں نے اپنے چہرے تک ابھر کر آنے والے آتشیں بخارات پر قابو پایا اور سکوت کے عالم میں ورسائی طرز کی کورنش سے اسے خوش آمدید کہا۔ وہ کسی ملکہ کی طرح مسکرائی اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ یہ بھی تقدیر کی براتوں میں سے ایک ہے، اور میں نے اس پھانس کو نکال دینے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا جو ایک عرصے سے میرے دل میں کھٹک رہی تھی۔ میں برسوں اس لمحے کا خواب دیکھتا رہا ہوں، میں نے کہا۔ ایسا لگا جیسے وہ نہیں سمجھی ہے۔ تم کچھ کہہ نہیں رہے! وہ بولی۔ اور تم کون ہو؟ مجھے کبھی معلوم نہ ہوسکا کہ آیا وہ واقعی بھول بھال گئی تھی یا یہ اس کی زندگی کا آخری انتقام تھا۔

فانی ہونے کے یقین نے، دوسری طرف، میری پچاسویں سالگرہ سے ذرا پہلے ایک اور ایسے ہی موقعے پر مجھے تعجب سے آلیا تھا، رقص وسرور کی ایسی رات کے دوران جب میں ایک بڑی بے پناہ عورت کے ساتھ اُپاچہ تانگو ناچ رہا تھا جس کا چہرہ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، جو مجھ سے چالیس پونڈ وزن میں زیادہ تھی اور قامت میں لگ بھگ ایک فٹ نکلتی ہوئی، اس کے باوجود مجھے رقص میں اپنی قیادت اس طرح کرنے دے رہی تھی جیسے ہوا میں بال و پر۔ ہم ایک دوسرے سے اتنے قریب رقص کررہے تھے کہ میں اس کے خون کی گردش کو اس کی رگوں میں محسوس کرسکتا تھا، اور اس کے تنفّس کی تیزی نے، اس کی تیزابی سوگندھ نے، اس کے حد سے زیادہ بڑے بڑے پستانوں نے مجھے لذّت سے تھپک تھپک کر تسکین دی ہی تھی کہ میں پہلی بار دہل کر رہ گیا تھا اور موت کی چنگھاڑ نے مجھے زمین پر تقریباً پٹخ دیا۔ یہ میرے کانوں میں کسی

سفاک غیبی آواز کی طرح تھا: تم چاہے کچھ بھی کرو، اس سال یا اگلے سو سال میں تم ہمیشہ کے لیے مرجاؤ گے۔ وہ مارے خوف کے مجھ سے جدا ہوگئی: کیا بات ہے؟ کچھ نہیں، میں نے کہا، اپنے دل پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے۔

''میں تمھاری وجہ سے لرز رہا ہوں۔''

اس کے بعد سے میں اپنی زندگی کا قیاس سالوں سے نہیں بلکہ دہائیوں سے کرنے لگا۔ میری پچاس کی دہائی فیصلہ کن تھی کیونکہ میں اس بات سے آگاہ ہوا کہ تقریباً ہر شخص ہی عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے۔ چھٹی دہائی بڑا شدید احساس ساتھ لائی کیونکہ مجھے یہ شک ہوا کہ میرے پاس مزید غلطیاں کرنے کا وقت نہیں رہا۔ میرے ستّر والے سال اس لیے خوف ناک تھے کہ ہوسکتا ہے یہ دہائی آخری نکلے۔ اس کے باوجود، نوّے کی دہائی کے اوّلین دن جب میں ڈیلگدینہ کے مسرت آگیں بستر میں بیدار ہوا، تو اس دل پذیر خیال سے مبہوت رہ گیا کہ زندگی وہ چیز نہیں جو پاس سے گزر جاتی ہے، ہیراکلیٹس کی ہمہ وقت تغیّر پذیر ندّی کی طرح، بلکہ توے کو الٹ کر مزید نوّے سال پکانے کا نادر موقع۔

میں وہ آدمی بن گیا جس کے آنسو بات بات پر نکل آتے ہوں۔ کسی بھی جذبے سے جس کا تعلّق گدازی سے ہو میرا گلا رندھ جاتا جس پر میں ہمیشہ قابو نہیں کرسکتا تھا، اور مجھے خیال آیا کہ ڈیلگدینہ کی سوتے میں نگرانی کرنا مجھے اب ترک کر دینا چاہیے، اپنی موت کی غیر یقینی کے باعث کم اور اس کا اپنی ساری زندگی میرے بغیر گزار دینے کے تصوّر کے سبب زیادہ۔ ان میں کے ایک بے اعتبار دن، میں نے اتّفاق سے خود کو بے حد نامی گرامی کالیہ دِلوس نوتاریوس میں پایا، اور مجھے وہاں ایک سستے سے قدیم ہوٹل کے ملبے سے زیادہ کچھ اور دریافت نہ کرکے تعجب ہوا، جہاں مجھے اپنی بارھویں سالگرہ سے ذرا پہلے فنِ عشق و عاشقی کی مبادیات سے زبردستی روشناس کرایا گیا تھا۔ یہ جہاز سازوں کی حویلی ہوا کرتی تھی، شہر میں کم ہی ٹھاٹھ باٹھ میں اس کی ہم سری کرسکتی تھیں، اور ایک داخلی صحن کے گرد سنگِ جراحت کی پرت کاری کے ستون اور ان کے اوپری حصوں پر طلاکاری اور ایک شیشے کا ہفت رنگ قبّہ جو کسی کنزرویٹری کی درخشندگی سے

دمک رہا تھا۔ ایک صدی سے اوپر، زیریں منزل پر جس کا گوتھک دروازہ سڑک کی جانب کھلتا تھا، نوآبادیاتی مصدّق الاسناد کے دفاتر واقع تھے جہاں میرا باپ کام کرتا تھا، جہاں پھلا پھولا تھا، اور ایک پوری عمر کے رنگ برنگے خوابوں کے ہاتھوں برباد۔ رفتہ رفتہ تاریخی گھرانوں نے بالائی منزلوں کو چھوڑ چھاڑ دیا اور بدحال خواتینِ شب غول درغول ان پر قابض ہوگئی تھیں۔ یہ یہاں صبح ہونے تک اپنے گاہکوں کے ساتھ جنھیں انھوں نے قریبی دریائی بندرگاہ کے شراب خانوں میں ڈیڑھ پیسو کے لیے پھانسا ہوتا زینے سے چڑھتی اترتی رہتیں۔

میں تقریباً بارہ سال کا تھا، ابھی تک نیکر اور اپنے ابتدائی اسکول والے بوٹ پہنتا تھا، اور بالائی منزلوں کو دیکھنے کی ہوک دبا نہ پاتا، اس حال میں کہ میرا باپ اپنی کسی غیر مختتم میٹنگ میں بحث رہا ہوتا، اور میری ایک سماوی منظر سے نظریں چار ہوئیں۔ عورتیں جو صبح تک اپنے جسموں کا سودا بڑی ارزاں قیمت پر کرتی تھیں، گیارہ بجے کے بعد ہی گھر میں گھومنا پھرنا شروع کرتی تھیں، اس وقت جب منقّش شیشوں سے آتی تپش ناقابلِ برداشت ہوجاتی تھی، اور وہ اپنی گھریلو زندگی عمارت میں ننگ دھڑنگ چلتے پھرتے گزارتیں، ساتھ ہی ساتھ مہماتِ شب پر اپنے مشاہدات بہ آوازِ بلند بیان کرتی جاتیں۔ میری سِٹّی گم ہوگئی۔ میری سمجھ میں صرف اتنا ہی آیا کہ جس راستے سے آیا ہوں اسی سے رفوچکّر ہوجاؤں، کہ ایک زنِ عریاں نے جس کا گدّر جسم کسی بھدّے صابن سے مہک رہا تھا مجھے عقب سے اپنی آغوش میں دبوچ لیا اور اپنے گتّے کے کھیبے میں اٹھا لائی، ایسے کہ میں اسے دیکھ بھی نہ سکا، کپڑوں سے آزاد اہالیانِ عمارت کی ستائشی نعرہ بازی کے درمیان۔ اس نے مجھے اپنے بستر پر چاروں خانے چت ڈال دیا، بڑی ماہرانہ پھرتی سے میرا نیکر کھینچ اتارا، اور میرے اوپر سوار ہوگئی، لیکن وہ برفانی دہشت جس نے میرے جسم کو جکڑ ڈالا تھا اس نے مجھے اس کو ایک مرد کی طرح قبول کرنے سے باز رکھا۔ اس رات، حملے کی خجالت کے باعث اپنے بستر میں بے خواب، اسے دوبارہ دیکھنے کی میری آرزو مجھے آدھے گھنٹے سے زیادہ نہ سونے دے سکی۔ لیکن اگلی صبح، جب بومِ شب پڑے سو رہے تھے، میں لرزیدہ اس کے کھیبے میں پہنچا اور اسے جگایا، اُس دیوانی محبت سے چلا چلا کر روتے

ہوے جو اس وقت تک قائم رہی جب تک حقیقی زندگی کی طوفانی ہوائیں اُسے نہایت بے رحمی سے اڑا نہ لے گئیں۔ اس کا نام کاستورینہ تھا اور وہ گھر کی ملکہ تھی۔

آنی جانی محبتوں کے لیے ہوٹل میں کیبنیے ایک پیسو کرائے پر ملتے تھے، لیکن ہم میں سے کم ہی یہ جانتے تھے کہ چوبیس گھنٹوں کا کرایہ بھی اتنا ہی ہوتا تھا۔ کاستورینا نے مجھے اپنی خستہ حال دینا سے بھی متعارف کرایا، جہاں یہ عورتیں اپنے نادار گاہکوں کو ناشتے پر مدعو کرتیں جن میں کسی جشن کا سماں ہوتا، انھیں اپنا صابن استعمال کرنے دیتیں، ان کے دانتوں کے درد کا مداوا کرتیں، اور اگر شدید ضرورت آ پڑے تو کارِ خیر کے طور پر ہی جفتی کرا دیتیں۔

لیکن میرے ڈھلتے بڑھاپے میں جاودانی کاستورینا کسی کو بھی یاد نہ رہی، جس مرے ہوے خدا جانے کتنا عرصہ گزر چکا تھا، جو دریائی عرشوں کے حقیر کونوں کھدروں سے ترقّی کر کے ایک بزرگ خانم کے عرشِ مقدس پر جلوہ افروز ہوئی تھی، اپنی ایک آنکھ پر جو شراب خانے کے ایک دنگے فساد میں جاتی رہی تھی بحری قزاق کی چشمی پٹی لگائے۔ اس کا آخری باقاعدہ سانڈ، جو خوناس کشتی کھینے والا غلام نام کا کاماگوی کا ایک خوش نصیب حبشی تھا، ہوانا کے ممتاز ٹرمپٹ نوازوں میں شمار ہوتا تھا تا آنکہ اس کی ساری مسکراہٹ ریل گاڑی کے ایک تباہ کن حادثے میں فنا ہو گئی۔

میں جب اس تلخ ملاقات سے لوٹا تو مجھے اپنے قلب میں وہ تیزی سے چمک اٹھنے والا درد محسوس ہوا جسے مَیں تین دن تک ہر قسم کی گھریلو اختراعات کے باوصف مندمل کرنے سے عاجز رہا۔ ڈاکٹر جس کو دکھانے کے لیے میں ایک ایمرجینسی مریض کے طور پر گیا ایک ممتاز خاندان کا فرد تھا، اُس ڈاکٹر کا پوتا جس نے جب میں بیالیس سال کا تھا تو میرا معائنہ کیا تھا۔ اور میں یہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا کہ وہ ہو بہو اس جیسا لگ رہا تھا، کیونکہ اس کا قبل از وقت گنجا پن، مایوس کن کوتاہ بین کی عینک، اور ناقابلِ تسلّی غمگینی اسے اتنا ہی عمر رسیدہ بنائے دے رہے تھے جتنا اس کا دادا ستّر برس کی عمر میں تھا۔ کسی سنار کی توجہ اور ارتکاز سے اس نے میرا باریک بین معائنہ کیا۔ اس نے میرے قلب اور پشت کی آواز سنی اور میرے خونی دباؤ، گھٹنوں کی اضطراری

حرکت، آنکھوں کی گہرائی، اور میرے زیریں پپوٹے کے رنگ کی کیفیت کا اندازہ کیا۔ وقفوں کے درمیان، جب میں معائنے کی میز پر اپنی جگہ بدل رہا ہوتا، وہ مجھ سے سوال کرتا جاتا جو اتنے مبہم اور سریع ہوتے کہ مجھے ان کے جواب سوچنے کا تقریباً وقت نہ ملتا۔ گھنٹہ بھر بعد اس نے میری طرف اطمینان سے مسکرا کر دیکھا۔ اچھا، وہ بولا، میں نہیں سمجھتا کہ میرے کرنے کے لیے کچھ ہے۔ کیا مطلب؟ تمھاری حالت تمھاری عمر میں جو بہترین حالت ہوسکتی ہے ویسی ہی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے، میں نے کہا، تمھارے دادا نے بھی جب میں بیالیس سال کا تھا یہی کہا تھا، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے بیچ میں وقت گزرا ہی نہ ہو۔ تمھیں ہمیشہ ہی کوئی مل جائے گا جو تمھیں یہی بتائے گا، اس نے کہا، کیونکہ ہمیشہ ہی تمھاری کوئی نہ کوئی عمر ہوگی۔ اسے کوئی دہشت ناک جملہ کہنے پر اکسانے کی کوشش میں مَیں نے کہا: واحد حتمی چیز موت ہے۔ درست، اس نے کہا، لیکن وہاں پہنچنا آسان نہیں اگر آدمی کی حالت اتنی ہی اچھی ہو جتنی تمھاری ہے۔ مجھے واقعی افسوس ہے کہ میں آپ کو مطمئن نہیں کرسکتا۔

وہ معزز یادیں تھیں، لیکن ۲۹ اگست سے پچھلے دن مجھے اپنے آگے آنے والی صدی کا بے انتہا بوجھ محسوس ہوا، جب، بے حسی کے عالم میں، مَیں اپنے گھر کی سیڑھیاں بوجھل قدموں سے چڑھ رہا تھا۔ پھر مجھے اپنی ماں نظر آئی، فلورینہ دِ دیوس، میرے بستر میں، جو انتقال سے پہلے تک اس کا ہوتا تھا، اور اس نے مجھے وہی دعائیں دیں جو اس وقت دی تھیں جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا، اس کی وفات سے دو گھنٹے پہلے۔ جذباتی شورش کی اس کیفیت میں مَیں نے اسے آخری علامت سمجھا، اور روسا کبر کس کو فون پر ہدایت کی کہ میری لڑکی کو اُسی رات لے آئے، مبادا نوے ویں سال کی آخری سانس تک زندہ رہ جانے کی میری امیدیں پوری نہ ہوسکیں۔ میں نے آٹھ بجے اسے دوبارہ فون کیا، اور اس نے پھر یہی دہرایا کہ ایسا کرنا ممکن نہیں۔ یہ ہونا ہی چاہیے، کسی قیمت پر بھی، میں دہشت کے مارے چلایا۔ اس نے خدا حافظ کہے بغیر فون بند کردیا، لیکن پندرہ منٹ بعد ہی فون کیا:

''ٹھیک، وہ یہاں ہے۔''

میں دس بج کر بیس منٹ پر پہنچا اور اپنی زندگی کے آخری خطوط روسا گبرگس کے حوالے کیے، مع اس انتظام کے جو میں نے اپنے بھیانک خاتمے کے بعد لڑکی کے لیے کیے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ میں قتل کے واقعے سے مت اُثر ہوا ہوں اور تمسخرانہ ادا سے بولی: اگر تم مرنے ہی پر مصر ہو تو یہاں نہ مرنا، ذرا تصوّر کرو۔ لیکن میں نے کہا، کہنا کہ پیورتو کولومبیا کی ٹرین نے مجھے مار ڈالا ہے، وہ قابلِ رحم کاٹھ کباڑ جو کسی کی جان لینے سے عاجز ہے۔

اس شب، ہر چیز کے لیے تیار، میں اپنی پشت کے بل اپنی اکیانویں سالگرہ کے پہلے ثانیے میں اٹھنے والے اپنے آخری درد کے انتظار میں لیٹ گیا۔ میں نے دور افتادہ گھنٹیوں کی آواز سنی، دَیلگدینہ کی روح کی مہک کو جب وہ پہلو کے بل سو رہی تھی دریافت کیا، میں نے افق پر ایک چیخ کو ابھرتے سنا، کسی کی سسکیاں جو شاید ایک صدی پہلے اسی کمرے میں موت سے ہم آغوش ہوا تھا۔ پھر میں نے اپنی آخری پھونک سے بتّی بجھادی، اپنی انگلیاں اس کی انگلیوں میں گوندھ دیں تاکہ اس کی قیادت کرسکوں، اور نصف شب کے بارہ گھنٹے اپنے آخری بارہ آنسوؤں کے ساتھ بجتے سنے تا آنکہ مرغ بانگیں دینے لگے، جن کے جلو میں حمد و ثنا کی گھنٹیاں بجیں اور میرے نوّوے ویں سال سے صحیح سلامت بچ نکلنے کے جشن کو منانے کے لیے تہواری آتش بازیاں چھوٹیں۔

میرے اوّلین الفاظ روسا گبرگس کے لیے تھے: میں گھر خرید لوں گا، ہر چیز، دکان اور باغ سمیت۔ اس نے کہا: چلو بوڑھوں والی شرط بدیں، مصدّق الاسناد کے سامنے اس پر دستخط کریں: دوسرے کی ہر چیز اُس کی جو زندہ بچ رہے۔ نہیں، کیونکہ اگر میں مرتا ہوں، تو ہر چیز اُس کے لیے ہونی چاہیے۔ دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں، روسا گبرگس نے کہا، میں لڑکی کی دیکھ بھال کرتی ہوں اور پھر ہر چیز اسی کے لیے چھوڑ جاتی ہوں، وہ بھی جو تمھاری ہے اور وہ بھی جو میری ہے؛ میرا دنیا میں کوئی اور نہیں۔ دریں اثنا، ہم تمھارے کمرے کو نئے سرے سے بناتے ہیں، اس میں بہتر پلمبنگ کا، ائیر کنڈیشنگ کا، انتظام کرتے ہیں، تمھاری کتابیں اور موسیقی۔

''کیا خیال ہے، وہ راضی ہوجائے گی؟''

''آہ، میرے غم زدہ اسکالر، بوڑھا ہونا تمھارے لیے جائز ہے، گاؤدی ہونا نہیں،'' روسا کَبرکَس نے کہا، ہنسی کی نقاہت سے۔ ''وہ بے چاری تمھاری محبت میں گلے گلے دھنسی ہوئی ہے۔''

میں باہر سڑک پر نکل آیا، درخشاں، اور اپنی صدی کے دور پار افق پر خود کو پہلی مرتبہ پہچانا۔ میرا گھر، خاموش اور سوا چھ بجے ہی سلیقے سے تیار، ایک مسرت آگیں فجر کے رنگوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ باورچی خانے میں دَیلگدینہ اپنی پوری آواز سے گا رہی تھی، اور دوبارہ زندہ کی ہوئی بلّی میرے ٹخنوں کے گرد اپنی دُم لپیٹے میرے ساتھ ساتھ میری میز کی طرف چلی آرہی تھی۔ میں اپنے پژمردہ کاغذات، دوات، قاز کے پر کے قلموں کو قرینے سے رکھ رہا تھا کہ سورج پارک میں بادام کے درختوں سے پھٹ پڑا اور دریائی ڈاک کشتی، جو خشکی کے باعث ایک ہفتہ دیر سے آرہی تھی، بندرگاہ کی آبنائے میں داخل ہوتے ہوئے ڈکرائی۔ یہ، انتہائے کار، حقیقی زندگی تھی، اس حال میں کہ میرا دل صحیح سلامت تھا اور اسے میری سوویں سالگرہ کے بعد کے کسی دن کے پرمسرت کرب میں محبت کی خوشی سے مرنے کی سزا ملی تھی۔

مئی ۲۰۰۴

وضاحت

اِس ترجمے میں تمام غیر اردو الفاظ کو، جو بیشتر اسماء یا عنوان ہیں، کولوبیا کے ہسپانوی تلفظ کے اعتبار سے اردو املا میں منتقل کیا گیا ہے۔ مثلاً، ''روزا'' (Rosa) کو ''روسا'' لکھا گیا ہے۔ مزید یہ کہ کولومبوی ہسپانوی میں عام طور پر دراز مصوّتے (long vowels) نہیں ہوتے اور بہت سے الفاظ کوتاہ مصوّتوں پر ختم ہوتے ہیں۔ اردو میں عام طور پر اس صورتِ حال کو ''چھوٹی ہ'' کے استعمال سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ لیکن کولمبوی ہسپانوی میں الفاظ پر تاکید (stress) کا استعمال ہوتا ہے، جو تلفّظ کے وقت دراز مصوّتے (long vowel) کا اشتباہ پیدا کردیتاہے، اور بعض اوقات انھیں اردو میں منتقل کرتے وقت ''الف،'' ''و'' اور ''ی'' کا استعمال ناگزیر ہوجاتا ہے۔

اسی طرح، جاپانی میں بھی تمام حروفِ صحیح (صوتیے) کسی نہ کسی کوتاہ مصوّتے کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ Yasunari Kawabata اور Eguchi کا صحیح جاپانی تلفّظ ''یَسُنَر ی کَوَبَتَا'' اور ''اِگُچِی'' ہے۔

—مترجم
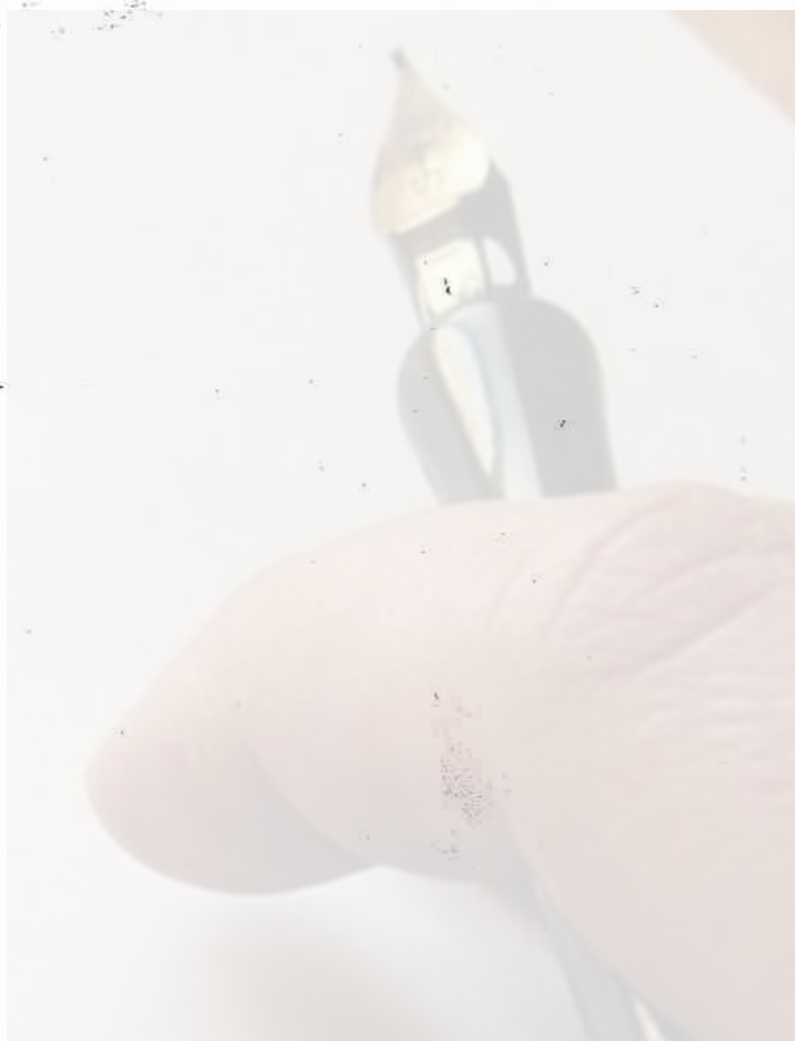
کہانی کے ایک نئے اور انوکھے انداز کا نام ہے گابرئیل گارسیا مارکیز۔ بے رحم، تلخ، سنگین حقیقت اور خیال و تصور کے جادو کو ایک ساتھ گوندھ کر وہ ایسی معجزاتی کہانیاں تخلیق کرتا ہے جن میں یہ نہیں پتہ چلتا کہ حقیقت کہاں شروع ہوتی ہے اور جادو کہاں ختم ہوتا ہے۔
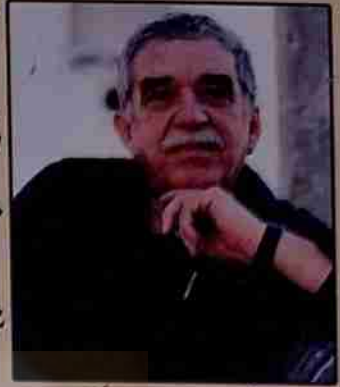
گابرئیل گارسیا مارکیز دنیا کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ادیبوں میں سے ایک ہے۔ اس کو ادب کا نوبل انعام بھی حاصل ہو چکا ہے۔

گابرئیل گارسیا مارکیز نے تقریباً دس برس کے وقفے کے بعد نیا ناول لکھا، اس بوڑھے کی کہانی جو اپنی زندگی کے نوے سال مکمل ہونے پر اپنے آپ کو ایک جیتا جاگتا تحفہ دینا چاہتا ہے۔ محبت کی جستجو، انسانی محرومی اور آرزو کی حوصلہ مندی کی یہ داستان مزاح اور الم کی عجیب دھوپ چھاؤں ہے۔

اس ترجمے کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ محمد عمر میمن کے قلم سے ہے۔ اُنہوں نے جدید اردو افسانوں کے کئی مجموعے انگریزی میں بڑی کامیابی کے ساتھ منتقل کیے ہیں۔ اسی طرح اُنہوں نے بین الاقوامی ادب کو اردو میں متعارف کرانے کے لیے تراجم کے سلسلے کا بیڑا اُٹھایا ہے اور اب تک بے شمار انگریزی کتابوں کے ترجمے کر چکے ہیں۔